برطانوی مستشرقین

اور

تاریخِ ادبِ اردو

ڈاکٹر علی جاوید

برطانوی مستشرقین نے مختلف ہندوستانی زبانوں
اور ان کی ادبیات کو اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش
کی ہے۔ ان کوششوں میں ادبی تاریخ کی تدوین بھی شامل
ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے ان کوششوں کا لیکھا جوکھا پیش کیا
ہے یہ وقت کی اہم ضرورت بھی تھی۔ ادب کی تفہیم اور ادبی
تاریخ دونوں میں فرد اور دور ہی کے نہیں قوموں کے تعصبات
اور تاثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے
سیاسی مصلحتیں اور تہذیبی تقاضے مسلمات بن جاتے ہیں اور
یہی چلن عام ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جہاں
برطانوی مستشرقین کی یہ کاوش قابل قدر ہے کہ وہ
ایک اجنبی زیر نگیں ملک کے ادب اور اس کے تہذیبی
سرمائے سے اتنا شغف رکھتے تھے وہاں یہ بھی ضروری
ہے کہ ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا بھی تدارک کیا
جائے تعصبات کی نشان دہی کی جائے اور ان مطالعوں
کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے حدود متعین کیے جائیں۔
ڈاکٹر علی جاوید نے ایک مبارک اور قابل قدر کام کا
آغاز کیا ہے امید ہے کہ ہماری ادبی تاریخ شناسی کا
یہ سلسلہ اور آگے بڑھے گا اور یہ کتاب تحقیق و تنقید کے
نئے ابواب کی ابتدا ثابت ہوگی۔

محمد حسن

پروفیسر محمد حسن
ڈی / ۷ - ماڈل ٹاؤن
دہلی ۹

ڈاکٹر علی جاوید

برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو

برطانوی مستشرقین

اور

تاریخِ ادبِ اردو

ڈاکٹر علی جاوید

مصنف

علی جاوید

استاد: ذاکر حسین پوسٹ گریجویٹ ایوننگ کالج
دہلی یونیورسٹی

طباعت: ثمر آفسیٹ پریس نئی دہلی
اشاعت: مارچ ۱۹۹۲ء
تعداد: ۶۰۰

ATUTHOR : ALI JAVED
TITLE : BARTANVI MUSTASHRIQUEEN AUR TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

(BRITISH ORIENTALISTS AND THE HISTORY OF URDU LITERATURE)

FIRST EDITION PUBLISHED IN DELHI : 1992.

DISTREBUTERS :

1. EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
GALI : AZIZ-UD-DEEN VAKIL KOOCHA PANDIT
LAL KUAN DELHI - 110 006

2. SEEMANT PRAKASHAN
922, KOOCHA ROHELA KHAN DARYGANJ,
NEW DELHI 110 002.

Publisher : Urdu Majlis, 221 Ghalib Apts., Pitam Pura, Delhi 34.

Rs 200/-

Sterling Pound 8/-
US Doller 10/-

ابّو،

تمہارے

اور تمہاری نظم کے اس بند کے نام یہ کتاب منسوب کرتا ہوں

جو تا بہ ہنوز میرے وجود میں سرگرم کار ہے:

شریکِ حال کچھ آنسو بھی ہیں پسینے میں
ہزاروں داغ ہیں انسانیت کے سینے میں
خراش پڑ گئی شفاف آبگینے میں
بہت سنبھال کے نشتر لگائے جاتے ہیں

مگر لہو ہے کہ لمحہ بہ لمحہ رستا ہے
یہ سوچتا ہوں کہ آخر معاملہ کیا ہے

اس کتاب کی اشاعت میں دہلی اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

مُشتملات

حرفے چند

برطانوی مستشرقین کی خدمات کے سلسلے میں اردو میں جو بھی کام ہوئے ہیں زیادہ تر ان کی بنیاد شخصیات پر رہی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں تاریخ ادبِ اردو کے بارے میں برطانوی مستشرقین کا رویّہ اور ان کی خدمات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر چند غیر برطانوی مستشرقین کو بھی شامل کیا گیا ہے جو براہ راست اس سلسلے کی ایک کڑی رہے ہیں۔

پہلے باب میں تاریخ ادب کے سلسلے میں مختلف علماء کے خیالات اور رویّے کا ذکر اور ان کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں برطانوی مستشرقین کی روایت اور اردو ادب کی تعلیم و ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں سر ولیم جونس، گل کرسٹ، گریرسن اور گراہم بیلی کی ادبی خدمات اور چوتھے باب میں گارساں دی تاسی، انا ماری شمل، رالف رسل، ڈیوڈ میتھیوز اور سی شیکل کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں اور آخری تجزیہ پیش کرتے ہوئے تاریخ ادب اردو کے سلسلے میں ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتابیات کی

فہرست کے بعد انڈیا آفس لائبریری، لندن میں موجود مستشرقین کی ہندوستانی تخلیقات کی فہرست پیش کی گئی۔

زیر نظر مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں جو دشواریاں پیش آئیں ان میں وسائل کی کمی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ استاد محترم پروفیسر محمد حسن کی کوششوں سے یورپ کے سفر پر جانے کا موقع ملا اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود مواد کی فراہمی ممکن ہو سکی لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے کئی اہم مقامات مثلاً ایڈنبرا دگل کرسٹ کا وطن) اور دیگر کتب خانوں میں مطالعے کا موقع نہ مل سکا۔

محدود ذرائع اور دیگر دشواریوں کے باوجود راقم الحروف کی کوشش جو زیر نظر مقالے کی شکل پا سکی وہ استاد محترم پروفیسر محمد حسن کی سرپرستی اور خلوص کا نتیجہ ہے جس کے لیے لفظ "شکریہ" ناکافی ہی نہیں بے معنی سا لگتا ہے۔ میں محترم سید غلام سمنانی صاحب اور ڈاکٹر عتیق اللہ کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں۔ جن کے مفید مطلب مشوروں نے میری عملی دشواریوں کو بڑی حد تک آسان بنا دیا۔

علی جاوید

باب: اوّل

ادبی تاریخ نویسی اور اس کی روایت

تاریخ کے بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ تصوّر پرست فلسفی اور مورّخ ہیں جن کے نزدیک تاریخ بعض تصوّرات کی مجسّم تعبیر کا نام ہے جو حقائق کی شکل میں مختلف ادوار میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کا خوبصورت ترین اظہار ہیگل نے تاریخ کو زمین پر خدا کی جلوہ فرمائی History is march of God on earth. سے کیا ہے۔ مختلف مفکّرین نے جن میں ہیرو اور ہیرو ورشپ Hero and Hero Worship. کا مصنّف تھامس کارلائل بھی شامل ہے، تاریخ کو عظیم الشان آدرشوں کی تعبیر قرار دیا ہے اور اسی راستے سے تاریخ برگساں کے تخلیقی ارتقاد کا ایک حصّہ بن جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں مادّئین materialists نے تاریخ کو سماجی تقاضوں کی تکمیل کا عمل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک افکار و خیالات متعلقہ سماجی حالات کا عکس ہوتے ہیں اور انھیں سماجی عوامل و محرکات کی بناء پر ظہور میں آتے ہیں۔ ان میں کارل مارکس اور دوسرے مفکّرین بھی شامل ہیں جنھوں نے تاریخ کو

مادی جدلیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اسی ضمن میں ٹوائن۔ بی کے نظریے Challenge and Response کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے جو تصور پرست ہونے کے باوجود تاریخی واقعات کو قوموں کی عملی تکمیل کا حصّہ سمجھتا ہے۔

ان نظریات سے قطع نظر تاریخ کے بارے میں بنیادی مسئلہ خود حقائق کی معروضیت کا ہے۔ تصور پرست فلسفیوں کے نزدیک حقائق کی حیثیت مکمل طور پر معروضی نہیں ہے بلکہ ان کا رشتہ محسوس کرنے والے سے خاصہ گہرا ہے اور اس اعتبار سے حقائق کو بڑی حد تک اضافی کہا جاسکتا ہے دوسری طرف مادیین نے بھی حقائق کی توسیع و تغیر کو اہمیت دی ہے اور انھیں مکمل طور پر مستقل بالذات اور غیر اضافی قرار نہیں دیا سوال یہ ہے کہ حقائق سے ہماری کیا مُراد ہے اور کیا حقائق ہی تاریخ کا واحد موضوع ہیں ؟

حقائق کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تاریخ کے جمع کیے ہوئے حقائق محض آثارِ قدیمہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا رشتہ ماضی کے حقائق سے اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ ماضی کو حال کی روشنی میں دیکھنے سے یا حال کے حقائق کو ماضی کے حقائق کی مدد سے سمجھنا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ تاریخ ماضی کے حقائق کی مدد سے حال کا مطالعہ کرنے کا ایک غیر معمولی طریقہ ہے۔[۱]

اس اعتبار سے تاریخ جن حقائق کا ذکر کرتی ہے وہ مردہ حقائق نہیں ہوتے اور اس کے باوجود کہ وہ گذشتہ دور سے تعلق رکھنے والے حقائق ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق گہرے طور پر عصرِ حاضر کے مسائل سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہر مورخ بیک وقت اپنے زمانے کو ماضی کے رشتوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اپنے ماضی کو حال کے رشتوں کی مدد سے بھی پہچاننے کی جدّوجہد میں مصروف رہتا ہے اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر مورخ صرف حال کی تفہیم ہی نہیں کرتا بلکہ

تشکیل بھی کرتا ہے اور برابر ماضی کی تاریخ سازی میں لگا رہتا ہے اسی تراش خراش
کی بناء پر مشہور روسی ہیئت پرست مفکر ائشن بام نے تاریخ کو دوہری بصیرتوں کا
علم science of double vision قرار دیا ہے۔

حقائق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری معروضی اور مستقل بالذات (مثلاً یہ
حقیقت کہ اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا بذات خود ظاہری معروضی اور
مستقل بالذات ہے اور اس میں نہ کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہے نہ توجیہ کی اور نہ
کسی دوسرے حقائق کی)۔ دوسرے ایسے حقائق جن کا تعلق متعدد دوسری حقیقتوں
سے ہوتا ہے۔ ان حقائق کی مختلف توجیہیں ہو سکتی ہیں اور ان کو دیکھنے کے
مختلف زاویے ممکن ہیں۔ اس طرح تاریخ لازمی طور پر حقائق کے باہمی رشتوں
کی داستان ہو جاتی ہے اور ایک حقیقت کا تعلق دوسری حقیقتوں سے مختلف
طریقوں پر دیکھا اور بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر مؤرخ کی ایک لازمی
مجبوری یہ بھی ہے کہ وہ مختلف حقیقتوں کو کسی نہ کسی مربوط وحدت میں ڈھالنا
چاہتا ہے اور انھیں کوئی نہ کوئی سمت یا شکل دینا چاہتا ہے اور تاریخ مختلف
اور ان مل بے جوڑ حقیقتوں کی کھتونی نہیں ہو سکتی بلکہ لازمی طور پر وہ ان حقیقتوں
کو کسی ایک نظام میں مرتّب کرنا چاہتی ہے اور تنوع و اختلاف کے درمیان ربط و
آہنگ کی تلاش کرتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ تاریخ ماضی پر کسی نہ کسی ہیئت کے
نفاذ کا نام ہے۔ imposition of form upon the past ۔ اس نقطۂ
نظر سے غور کیا جائے تو تاریخ ایک نئی معنویت کی جستجو معلوم ہوتی ہے۔

تاریخ کیا ہے؟ صرف حقائق کا یکجا کر دینا یا کچھ اور بھی؟ ظاہر ہے تاریخ حقائق
کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ تاریخی حقائق یا ماضی کو ان کے مسائل کی روشنی
میں حال کی نظروں سے دیکھنا۔ اور اس طرح ایک تاریخ نویس کا کام محض حقائق جمع

کرنا نہیں بلکہ ان کا تجزیہ کرنا بھی ہے۔[۲]

تاریخ خالص طور پر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ اِس لیے جب ہم تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہوں تو اس بات پر زیادہ دھیان دینا چاہیے کہ تاریخ لکھنے والا کون ہے۔[۳]

اس کے علاوہ جس دور کے لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جا رہا ہو، ان لوگوں کے بارے میں تاریخ نویس کی تخیلاتی فہم Imaginative understanding کا ہونا ضروری ہے اس سلسلہ میں وہ یہ بات صاف کر دیتا ہے کہ تخیلی سمجھ کو ہمدردی Sympathy سے خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔[۴]

تیسرے یہ کہ ہم ماضی کا تجزیہ اور ماضی کی فہم صرف حال کی روشنی میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہم حال کی روشنی میں تاریخ بناتے ہیں جو ہمارے لیے بادشاہوں کی فتوحات کی کہانیاں نہیں بلکہ سماجی حقائق کی نشاندہی کرتی ہیں۔

تاریخ کے سلسلہ میں مختلف رویوں میں ایک رویہ حقائق کے بیان کا رہا ہے اور ای۔ایچ۔ کار انیسویں صدی کو "a great age for facts" حقائق کا دورِ عظیم کہتا ہے جس کی نمائندہ مثال گریجرنڈ Gradgrind کے یہاں تلاش کرتا ہے جو کہتا ہے کہ "مجھے صرف اور صرف حقائق درکار ہیں کیوں کہ زندگی میں صرف حقائق کی ضرورت ہوتی ہے۔"[۵]

اس کے مقابلہ میں امریکی تاریخ نویس کارل بیکر Carl Becker کہتا ہے کہ تاریخی حقائق اس وقت تک وجود میں نہیں آتے جب تک کہ تاریخ نویس انھیں خود پیدا نہیں کرتا۔[۶]

لیکن تمام تاریخی خیالات کو کروچے ایک بالکل نیا موڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی تاریخ عصری تاریخ ہوتی ہے اور اسی سے تاریخ کا رویہ کہ ماضی کو حال کی روشنی میں دیکھا جائے مقبول ہوا۔[۷]

یہ بات غور طلب ہے کہ تاریخ کو حال کی روشنی میں دیکھنا اور سماجی تجزیہ کرنا یا تاریخ کے ذریعہ سماجی حقائق تک پہونچنا اور حال کی گتھیوں کو ماضی کے سامنے رکھ کر دیکھنے اور سلجھانے کا نظریہ کارل مارکس کے ایک ہی جملہ سے مل جاتا ہے۔ جس نے آگے آنے والے تاریخ نویسوں کے لیے نہ صرف نئی راہ ہموار کی بلکہ مشعل راہ کا کام کیا اور وہ جملہ جس نے ساری دنیا کے دانشوروں کے نظریات میں انقلاب پیدا کر دیا وہ یہ تھا کہ " آج تک کے تمام موجودہ سماج کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ رہی ہے" ۸

تاریخ نویسی کا کوئی بھی نقطۂ نظر کیوں نہ اپنایا جائے توجیہہ، تشریح اور تعبیر تاریخ کے لازمی اجزا بن کر سامنے آتے ہیں۔ حقائق کو پیش کرنے کے لیے لازمی طور پر مورخ کو کسی نہ کسی نظریاتی بنیاد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور خواہ وہ کتنا ہی معروضی یا سائنسی ہونے کی کوشش کیوں نہ کرے اسے حقائق کی توجیہہ اور تشریح ہی میں نہیں بلکہ حقائق کے انتخاب اور ردّ و قبول میں اور ان کو کم یا زیادہ اہمیت دینے کے سلسلہ میں بھی اپنی نظریاتی وابستگی مختلف نوعیتوں کی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مورخ کی ذاتی پسند و ناپسند، اس کا طبقاتی کردار، اس کا تاریخی نقطۂ نظر اور اس کی عصری شخصیت سبھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے تاریخ صرف حقائق ہی کو نہیں، مورخ کی تاریخی اور تہذیبی شخصیت اور نظریاتی موقف کا بھی اظہار ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے بعض مورخین اور فلسفیوں نے تاریخ کو مورخ کا تجربہ قرار دیا ہے کیوں کہ تاریخ نویسی، تاریخ سازی کا واحد طریقہ ہے (To write history is the only way of making it) اسی ضمن میں ای۔ ایچ۔ کار لکھتا ہے: ۹

تاریخ میں مورخ کے علاوہ اس کی عصری بصیرت اور نظریاتی وابستگی جس طرح اثر انداز ہوتی ہے اس کا اندازہ ہندوستان کی تاریخ نویسی کے مختلف رجحانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر روملا تھاپر نے اپنے ایک مقالہ میں افادیت

پرستوں utilitarians کی تاریخ نویسی اور پھر اس کے ردعمل کے طور پر ہندوستان کے قوم پرست مورخوں کی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ مل Mill اور دوسرے افادیت پرست utilitarians مورخین کا خیال تھا کہ برطانوی حکمراں ان نوآبادیات کے غیر متمدن محکوم اقوام کو علم اور تہذیب کا درس دینے کے تاریخی منصب کو پورا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے قوم پرست مورخوں نے اپنے وطن کے دورِ قدیم کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ مغربی اثرات کے عام ہونے سے قبل بھی ہندوستان ایک تہذیب یافتہ اور متمدن ملک تھا۔[۱]

تاریخ نویسی کے یہ مسائل اس وقت اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب مورخ اس ملک سے تعلق نہ رکھتا ہو جس ملک کی تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بنیادی ماخذوں تک رسائی حاصل نہ ہو پانا یا ان سے ناکافی واقفیت ہونا یا تہذیبی مغائرت اور اقدار کا اختلاف یا مقاصد اور نیّت کا مختلف ہونا۔ یہ سب امور دیانت دارانہ تاریخ نویسی کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں اور ایسے موقعوں پر تاریخ اور مورخ کے درمیان تضاد یا اختلاف پیدا ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

ادبی تاریخ کا تصور دراصل ہمیں مغرب سے ملا۔ کچھ لوگ اسے اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں یا افکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر محاکمے شامل ہوتے ہیں۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات کو بے کم و کاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے نے اسے ایک طرح کی قومی سوانح عمری کہا ہے سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے جس میں ان کارناموں کی بازآفرینی ہو۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگلستان کی ادبی تاریخ اس کی قومی روح کے اخلاقی آہنگ کا زیر و بم ہے۔ کچھ لوگ اسے فن کی تاریخ سمجھتے ہیں جس میں دلچسپی کے لیے مصنّفین کی سوانح عمریاں اور کچھ منفرد فن پاروں کی قدر شناسی (appreciation) شامل ہو۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ ایسا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے۔ اے۔ سیمنڈز ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ادبی اصناف کا ارتقا، ادبی تاریخ کا سب سے اہم جزہے کیوں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھا جاتے اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض جرمن اور امریکی فلسفیوں نے اس باعثِ ادب کے ارتقاء کو جمالیات کے ارتقا کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس مطالعے سے ادب کے مطالعے کے اصول اخذ کیے ہیں۔

ادبی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں ادیبوں اور دانشوروں میں کافی اختلافِ رائے رہا ہے اور یہ اختلاف ادیبوں کو ایسی جگہ لاکر کھڑا کر دیتا ہے جہاں ایسا گروہ جو ادب کی سماجی افادیت کی وکالت کرتا ہے، ادبی تاریخ لکھنے کا قائل ہے اور وہ لوگ جو ادب اور سماج کو الگ الگ کرکے دیکھنے کے قائل ہیں ۔ ادبی تاریخ لکھنے کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں. ایسا نہیں ہے کہ ان ہر دو گروہ میں آپس میں بالکل اختلاف رائے رہا ہو۔ بلکہ مختلف لوگوں نے ادبی تاریخ نویسی کو الگ الگ طرح سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ٹامس وارٹن (Thomas Warton) ادبی تاریخ کے مطالعے کا اس لیے قائل ہے کہ یہ زمانے کے واقعات کو باقاعدگی سے قلم بند کرتی ہے اور اس طرح بے حد دلکش طرز معاشرت کا واضح نقشہ پیش کرتی ہے اور اسے محفوظ رکھتی ہے۔[۱۱] ہنری مارلے ادبی تاریخ قومی تذکرہ National Biography اور انگریزی ذہن کی کہانی سمجھتا ہے۔[۱۲]

اس سماجی نظام میں کچھ لوگ تاریخ بناتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ اس ہی بنائی تاریخ کا استعمال کرتے ہیں۔ جو تاریخ بناتے ہیں وہ تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں اور جو اس کا استعمال کرتے ہیں وہ تخلیقی عمل کو بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان اپنی تاریخ کا تجزیہ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے بناتا اور بدلتا بھی ہے۔[۱۳]

ادبی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے منیجر پانڈے نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ صرف جانور ہی تاریخی فہم اور تخلیق کی ذمہ داری سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ادبی تاریخ کے مخالف ہیں وہ بنیادی طور پر ادب میں جمود، ادبی روایات سے آزادی یا مجموعی اعتبار سے ادب برائے ادب کے قائل ہیں لیکن دوسری طرف ادبی تاریخ کے حامی بھی۔ یہ لوگ ادب کو تاریخ وار سلسلہ واقعات سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ ادب کا تہذیبی روپ بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے ادبی اثرات اور سارے سماج کو سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے ایسے لوگوں نے ادبی تاریخ نویسی کو صرف حقائق یکجا کرنے تک محدود کر دیا اور انھیں بنیاد پر تاریخ نویسی کے مخالفین نے ان کمزوریوں سے فائدہ بھی اٹھایا۔

کیر نے ادبی تاریخ نویسی کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ادبی تاریخ کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا مقصد ہمیشہ حال کو مدِّ نظر رکھنا ہوتا ہے۔[۱۴] ٹرگرٹ نے تاریخ نویسی کی مخالفت اس لیے کی کہ اسے ایک شخص لکھتا ہے۔[۱۵] رینے ویلیک نے بہت ہی بنیادی سوال اٹھایا کہ اس طرح تمام علوم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے اور علوم کو بکواس کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے کیوں کہ لکھنے والا ایک فرد واحد ہوتا ہے۔[۱۶]

ادبی تاریخ نویسی کی مخالفت کرتے ہوئے بیٹسن کہتا ہے کہ ادبی تاریخ میں

ایک چیز دوسرے سے ماخوذ ہوتی ہے اور جب کہ تنقید میں ایک چیز کو دوسرے سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۲۱ے اس طرح اس کے خیال کے مطابق پہلے تو مختلف حقائق کی روشنی میں ادب کا تجزیہ ہوتا ہے اور پھر نظریات اور اعتقادات کا دخل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں غیر جانبدار حقائق نہیں ہوتے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غیر جانبدار حقائق ہوتے ہیں تو یہ حقائق تاریخ، عنوان یا سوانحی واقعات تک محدود ہوتے ہیں جن سے ادب کی تاریخی اسناد کی تدوین تو ہو سکتی ہے لیکن ادبی تاریخ لکھنے کے لیے صرف یہی چیزیں درکار نہیں ہوتیں۔ تاریخ نویسی کے سلسلے میں بہت سی خام خیالیوں کا ذکر کرتے ہوئے رینے ویلیک نے لکھا ہے کہ ایسے لوگ جو ادبی تاریخ نویسی میں تنقید کی مخالفت کرتے ہیں وہ اپنے آپ میں نادانستہ طور پر خود بھی نقاد ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر روایتی معیار کی چھاپ ہے اور آج کے دور میں ان کی حیثیت ایسے موخر رومانویوں belated Romanticists کی ہے جنھوں نے تمام ادب اور خصوصاً جدید ادب کی فہم سے منھ موڑ لیا ہے یا سوچنا بند کر دیا ہے۔ ۲۲ے

اہم یہ ہے کہ ادبی تاریخ لکھتے وقت کسی ادب پارے کے وجود میں آنے کے اسباب یعنی ماخذ اور اثرات کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم بیسویں صدی کی ادبی تاریخ لکھ رہے ہیں تو اس بات کا علم ضروری ہے کہ انیسویں صدی اور اس سے پہلے کی ادبی اقدار کیا تھیں اور جس زمانے کی تاریخ لکھی جا رہی ہے، اس زمانے کے سماجی اور معاشی حالات کیا تھے اور مختلف اصناف کی مختلف ادوار میں کیا اہمیت تھی اور اس کے اسباب وغیرہ۔

اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے رینے ویلیک نے اپنی تصنیف (Theory

(of Literature میں اسے ایک نئے طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ بٹیسن کے اس کے نظریے سے بحث کرتا ہے کہ ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کی ضرورت نہیں کیونکہ اس میں حقائق ایک دوسرے سے ماخوذ ہوتے ہیں یا ایک چیز کو دوسری سے بہتر ثابت کیا جاتا ہے۔ ویلیک نے بجا طور پر ثابت کر دیا ہے کہ دونوں صورتوں میں تنقیدی شعور کا عمل دخل لازم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقاد اپنے دور کے مطابق قدیم ادبی شہ پاروں کو پرکھتا اور جانچتا ہے جبکہ ادبی مورخ کے سامنے ادبی شہ پارے کا زمانہ ہوتا ہے۔ تنقید کا رشتہ حال سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، ادبی تاریخ کا ماضی سے، ادبی مورخ کو صرف اپنے زمانے ہی کی میزان پر شہ پاروں کو پرکھنا نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کے آئینے میں بھی شہ پارے اور ہر ادبی تحریک کو دیکھنا ہوتا ہے۔ گویا مورخ کے نزدیک مرکزی اہمیت خود ادیب کے مقصد کی تشکیلِ نو کی ہوتی ہے اور وہ ادیبوں کے مقاصد کے آئینے میں بدلتی ہوئی حیثیت کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کی مدد سے تاریخ کی ترتیبِ نو کرتا ہے۔ اس کے سامنے کسی فن پارے کی اس کے اپنے دور میں مقبولیت کا معیار ہوتا ہے لیکن در حقیقت کوئی بھی فن پارہ نہ تو محض تاریخ کا گذرا ہوا واقعہ ہے جس کو صرف اس کے اپنے ہی دور کے پسِ منظر میں رکھ کر دیکھنا اور پرکھنا ضروری ہوا اور نہ کوئی ایسی ازلی اور ابدی تخلیق ہے جس کا کوئی تعلق اس کے زمانے اور ماحول سے نہ ہو۔ یعنی وہ بیک وقت بدلتے ہوئے تاریخی لمحوں کی زد میں بھی ہے اور مکمل طور پر ان بدلتے ہوئے حالات کا شکار بھی نہیں ہے کیوں کہ اپنے زمانے اور ماحول کے ختم ہو جانے کے صدیوں بعد بھی زندہ رہتا ہے اور پڑھنے والوں کو لطف اندوز کرتا ہے۔ اس لیے ویلیک نے تاریخ ادب کے سلسلے میں تاریخیت (Historicism) اور مطلقیت (Absolution) دونوں کو رد کر کے ایک نئی اصطلاح تناظریت

(Perspectivism) وضع کی جس سے یہ لازم آتا ہے کہ نہ تو کسی فن پارے کو محض بیتی ہوئی تاریخ کا حصّہ سمجھ کر اسے پرانے زمانے کے نوادر کی طرح مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی شہ پارے کے زمانے اور علاقے کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے اسے تاریخ سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے بلکہ دونوں زاویۂ نگاہ سے اسے دیکھنا لازم ہے اور تاریخ ادب اسی دوہری بصیرت کو کام میں لاتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ادبی تاریخ کو نہ محض ادبی فن پاروں کی جمالیاتی کیفیات یا تنقید قرار دیا جاسکتا ہے نہ محض بدلتے ہوئے مذاقِ سخن کی دستاویز۔ بلکہ وہ زبان اور ادب کے نشوونما کی داستان بھی بیان کرتی ہے اور ان کے پیچھے بدلتے ہوئے ادبی ذوق کی کہانی بھی کہتی ہے۔ ادبی تاریخ ادب اور سماج دونوں کو مکمل اکائی کی شکل میں دیکھتی ہے اور ادب کو سماج کی تخلیق اور ادب کے سماج پر اثرات دونوں کے رابطے سے بحث کرتی ہے۔ ادب نہ تو محض خیالات سے عبارت ہے نہ محض جمالیاتی کیفیات سے بلکہ ان دونوں سے مل جل کر جو حسیت انفرادی اور اجتماعی سطح پر رُونما ہوتی ہے وہ کسی اور کی آپ بیتی کا حصّہ کہی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تاریخ، تاریخ کا تکملہ بھی ہے اور ادب کا بھی۔ ادبی تنقید اس سماجی سیاق وسباق کو بڑی حد تک چھوڑنے پر اس وجہ سے مجبور ہے کہ وہ ماضی کا حصّہ بن چکا ہے۔ تاریخ ادب اسے فراہم کرتی ہے اور صرف مورخ کے ادبی ذوق ہی پر اسے نہیں پرکھتی بلکہ ان سماجی حالات کے پیشِ نظر بھی اسے پرکھتی ہے جن میں فنکار یا ادبی تحریک کی تخلیق ہوئی۔ اسی طرح تاریخ جس ادبی حسیت کو نظر انداز کرکے محض واقعات اور افکار کی مدد سے اپنے دور کا نقشہ تیار کرنے پر خود کو مجبور پاتی ہے تاریخ ادب اسے مختلف ادوار میں پلنے والی اس لطیف حسیت کا تجزیہ کرنے اور اسے مربوط اور منضبط شکل

میں پیش کرنے اور ان کے سماجی عوامل و محرکات سے ہم آہنگ کرنے کا نام ہے۔ اس طرح تاریخ ادب لازمی طور پر ادب اور سماج کے درمیان رشتے کا کام دیتی ہے۔

لہذا تاریخ یا تاریخ ادب دونوں پر مورخ کا انداز نظر اور اس کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا معیار ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ جس طرح ہر ادب پارے میں اتفاقی (accidental) اور لازمی (essential) عناصر موجود ہوتے ہیں اور ادبی نقاد کا فرض ہے کہ اتفاقی (یا روایتی) عناصر کو الگ کرکے فن پارے کے بنیادی اور لازمی امتیازی اجزاء کی شناخت فراہم کرے۔ اسی طریقے پر ادبی مورخ کے لیے لازم ہے کہ وہ ادبی تاریخ کے مختلف اتفاقی عناصر کو نظر انداز کرکے اس کے لازمی عناصر پر زور دے۔ اس عمل میں نہ صرف ادبی مورخ کی بصیرت کام آتی ہے بلکہ اس کی جانبداری، اس کا تاریخی شعور، اس کی پسند و ناپسند کے معیار، اس کے نسلی و نظریاتی تعصبات سبھی کسی نہ کسی طرح ادبی تاریخ کی ترتیب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی مرکزی تصور کو گولڈمان نے ادبی مؤرخ کے عالمی تصور (World Vision) سے تعبیر کیا ہے۔[۱۹]

ادبی مورخ کے لیے دوسرا اہم مرحلہ خود زبان کی پیدائش اس کی ماہیت اور اس کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات کی چھان بین اور رد و قبول ہے۔ کیوں کہ یہاں مسئلہ کسی فن پارے کی جمالیاتی قدر و قیمت کے تعین کا نہیں ہے بلکہ زبان کی تخلیق و تشکیل میں معاون ہونے والے گوناگوں سماجی، اقتصادی، تہذیبی عوامل و محرکات کے باہمی عمل و ردعمل کا ہے جس کے نتیجے کے طور پر نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں اور نئی زبانیں بنتی ہیں اور نت نئے اسلوب پروان چڑھتے

ہیں۔ اس مرحلے پر ادبی مورخ محض ادب اور جمالیات کی حد بندیوں میں رہ کر کام نہیں کرتا بلکہ اس کو تہذیب کو تشکیل دینے والے اور زبان کو بنانے والے سبھی عناصر کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے اور ان کی آمیزش سے پیدا ہونے والے اثرات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے گویا ادبی مورخ، ادبی تاریخ کی ابتدا ہی میں ادب اور تہذیب، ادب اور سماج کے باہمی رشتوں پر غور کرنے پر مجبور ہے اور اس تجزیے میں لازمی طور پر اسے کوئی نہ کوئی تصورِ تاریخ بھی اپنانا ہوتا ہے اور ادب، زبان اور تہذیب کے رشتوں کو کسی نہ کسی نظریاتی رُخ سے پیش کرنا بھی لازم ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ مختلف ادوار اور علاقوں کے ادب کے درمیان یکسانیت اور اختلافات کی تلاش ہے۔ اگر ہر ادبی فن پارے کو ایک منفرد اور دوسروں سے کٹا ہوا جزیرہ سمجھا جائے تو ادبی تاریخ کا تصوّر ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے ہر ادبی مورخ کو ایک دور میں لکھے جانے والے ادبی فن پارے کا تقابلی مطالعہ، دوسرے دور میں لکھے جانے والے ادبی فن پارے سے کرنا ہوتا ہے اور پھر ان میں سے ہر دور کے فن پاروں کے درمیان انفرادی خصوصیات کے باوجود ایسے اجتماعی امتیازات کا پتہ لگانا ہوتا ہے جو کسی ایک دور کے فن پاروں کی شناخت بن سکیں اور انھیں دوسرے دور یا دوسرے علاقوں کے فن پاروں سے الگ کر سکے۔ یعنی ادبی مورخ، ادبی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرتا ہے اور ان کی ادبی خصوصیات متعین کرتا ہے۔ اسی طرح ادب میں مختلف تحریکوں کی نشاندہی اور ان کے زیرِ اثر تخلیق کردہ فن پاروں کی شناخت بھی ادبی تاریخ کے دائرے میں آتی ہے۔

تیسرا مرحلہ ادب کے تاریخی اور جمالیاتی تسلسل اور اس کے مزاج کی

پہچان کا مرحلہ ہے۔ ہر ادب دوسرے ادبیات سے بہت کچھ اثرات قبول کرتا ہے۔ لیکن اس اثر پذیری کے باوجود شاید ہی کوئی ادب ہو جس کی کوئی امتیازی ادبی روایت نہ ہو اور اس کے ادبی فن پاروں کے معیار و اقدار اس مخصوص روایتی پیمانوں پر طے نہ ہوتی ہوں۔

یہ تمام مراحل یوں بھی ہر ادبی مورخ کو پیش آتے ہیں اور جس طرح غالبؔ نے اشعار کے انتخاب کو اپنے دِل کا معاملہ کھلنے کا سبب بتایا تھا:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اسی طرح ہر ادبی مورخ کی تاریخی بصیرت اور اس کی تہذیبی و نظریاتی وابستگیوں کا حال اس کی مرتب کردہ تاریخ ادب سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اگر مورخ کسی دوسرے ملک یا نسل کا یا مختلف ادبی روایات و لسانی روایات سے تعلق رکھتا ہو تو یہ پیچیدگیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

مستشرقین کے سلسلے میں یہ دقتیں اسی بنا پر کئی اعتبار سے نہایت فکر انگیز اور پیچیدہ ہو گئی ہیں۔

حواشی و حوالے

۱ہ Eicher Baum - Literary Environment - 1929

"History is a special method of studying the present with the aid of the facts of the past."

"تاریخ حال کو ماضی کے حقائق کے ذریعے سمجھنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے"

۲ہ E.H. Carr - What is History - Page:21 (Penguin Books-1976)

"....history consists essentially in seeing the past through the eyes of the present and in the light of its problems, and that the main work of the historian is not to record, but to evaluate; for, if he does not evaluate, how can he know what is worth recording?"

"تاریخ بنیادی طور پر ماضی کو حال کی نگاہوں سے دیکھنے پر مشتمل ہے اور یہ کہ اس کا مطالعہ اس کے اپنے مسائل کی روشنی میں ہو۔ مورخ کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ صرف تذکرہ نگاری کرے بلکہ اس کا معیار بھی متعین کرے کیونکہ

اگر وہ معیار کا تعین نہیں کرتا ہے تو وہ کیسے جان سکے گا کہ کون سا مواد قابل اندراج ہے"۔

۳ے Ibid Page: 23

"Study the historian before you begin to study the facts."

"حقائق کا مطالعہ کرنے سے پہلے مورخ کا سمجھنا ضروری ہے"۔

۴ے E.H. Carr - What is History Page: 24

"History can not be written unless the historian can achieve some kindof contact with the mind of those about whom he is writing."

"تاریخ اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک کہ مورخ ان لوگوں کے ساتھ ایک ذہنی رابطہ قائم کر لے جن کے بارے میں وہ لکھ رہا ہے"۔

۵ے Ibid Page: 8

"What I want is Facts --- Facts alone are wanted in life."

"مجھے صرف حقائق درکار ہیں ... زندگی میں صرف اور صرف حقائق کی ضرورت ہوتی ہے"۔

۶ے Atlantic Monthly, Oct. 1910, Page: 528

"....the facts of history do not exist for any historian till he creates them."

"... تاریخ کے حقائق کا اس وقت تک کوئی وجود نہیں ہوتا جب تک

کہ مورخ ان کی تخلیق خود نہ کرے۔

۷ے B.Croce - History as the story of liberty (English Translation, 1941 Page: 19)

"The practical requirements which underlie every historical judgement give to all history the character of "Contemporary history"because, however remote in time events thus recounted may seem to the history, in reality refer to present needs and present situations wherein those events vibrate."

"وہ عملی مطالبے جو کسی تاریخی فیصلے کے بین السطور میں ہوتے ہیں تاریخ کو عصری تاریخ کے کردار میں بدل دیتے ہیں کیونکہ واقعات زمانے کے اعتبار سے تاریخ کے لیے کتنے ہی بعید کیوں نہ ہوں فی الحقیقت موجودہ ضروریات اور موجودہ حالات سے متعلق ہوتے ہیں جن میں وہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

۸ے "The history of all hitherto existing society is the history of class struggles."

"تمام موجودہ سماج کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔

۹ے E.H. Carr - What is History Page : 22

"... history ... the reconstitution of the past in the historian's mind ... is dependent

on empirical evidence. But it is not in itself an empirical process, and can not consist in a mere recital of facts. On the contrary, the process of reconstitution governs the sell-ection and interpretation of the facts."

"... تاریخ ... جو مورخ کے ذہن میں ماضی کی ترتیبِ نو ہے تجرباتی شہادت پر منحصر ہے۔ لیکن یہ بذات خود کوئی تجرباتی سلسلہ اور صرف واقعات کا بیان ہی نہیں ہے اس کے برخلاف ترتیبِ نو کا یہ سلسلہ واقعات کے انتخاب اور ان کی تاویل پر محیط ہے۔"

۱۰؎ Romila Thapar - Communalism and the Writing of Indian History (P.P.H., New Delhi) Pages: 1,5 & 4.

"Thus, Hindu communalists try and project an ideal Hindu society in the ancient period and attribute the ills of India to the coming of the 'Muslims'. Equally, Muslim communalists try and prove the roots of separatism from the beginning of the medieval period onwards, i.e., from the 11th or 13th century A.D. (P.1)

Where nationalism is coupled with coloni alism and an anti-imperialist situation,

then the glorification of the past serves as a kind of consolation for the humiliation of the present. (P.5)

... Mill's History of British India was that in a sense it laid the foundation for a communal interpretation of Indian history and thus provided the historical justification for the two-nation theory. He was the first historian to develop the thesis of deviding Indian history into three periods which he called Hindu civilisation, Muslim Civilisation and British Civilisation (interestingly enough, not Christian Civilisation)." (P.4)

" اس طرح ہندو فرقہ پرست قدیم زمانے میں ہندو سماج کی ایک آدرش تصویر پیش کرنے اور ہندوستان کی برائیوں کو مسلمانوں کی آمد سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان فرقہ پرست، علیحدگی پسندی کی جڑیں عہدِ وسطیٰ یعنی گیارہویں یا تیرہویں صدی سے ثابت کرتے ہیں۔

یہاں بھی قومیت نوآبادیاتی نظام اور سامراج دشمن حالات سے دوچار ہوتی ہے تو اس وقت ماضی مدح و ستائش، دورِ حاضر کی ذلت و

رسوائی کے تسلّی و تشفّی کا کام کرتی ہے۔

...... برطانوی دور کے ہندوستان کے متعلق مِل کی تاریخ نے ان معنوں میں ہندوستانی تاریخ کی فرقہ وارانہ تاویل کی بنیاد رکھی ہے اور اس طرح دو قومی نظریے کا تاریخی جواز پیش کیا۔ وہ پہلا مورخ تھا جس نے ہندوستانی تاریخ کو تین حصّوں میں تقسیم کرنے کی داغ بیل ڈالی جس کو اس نے ہندو تہذیب، مسلم تہذیب اور برطانوی تہذیب کا نام دیا۔ (دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے عیسائی تہذیب کا نام نہیں دیا)۔

۱۱ے Thomas Warton - History of English Poetry, I (1774) Page: II

"... faithfully records the feature of the time and preserves the most picturesque and expressive representation of manners."

"... یہ بہت ہی سچائی کے ساتھ وقت کے وخال کو مندرج کرتی ہے اور بہت ہی مصوّر اور موثر طریقے پر کردار کی نمائندگی کرتی ہے۔

۱۲ے Henry Morley - English Writer, Page: I (London-1864)

۱۳ے पाण्डेय, मैनेजर:' आलोचना ' त्रैमासिक नं. 37 अप्रैल - जून, 1976, दिल्ली ।

۱۴ے W.P. Ker (ص ۲۵۴ Theory of Litt. (بحوالہ رینے ویلیک)

۱۵ے F.J. Treggart - Theory of History (بحوالہ رینے ویلیک)

۱۶؎ Rene Wellek and Austin - Theory of literature
Page 255

۱۷؎ F.W. Bateson (بحوالہ رینے ویلیک - ص ۴۰)

"Literary history shows A to derive from B, while criticism pronounces A to be better than B."

ادبی تاریخ زید کو بکر سے حاصل کرنے کا طریقہ بتاتی ہے جبکہ تنقید زید کو بکر سے بہتر بتاتی ہے۔

۱۸؎ Rene Wellek and Austin Warren,
Theory of Literature Page : 43

"Literary historians who deny the importance of criticism are themselves unconcious critics, usually derivative critics, who have merely taken over traditional standards and reputations. Usually, today, they are belated Romanticists who have closed their minds to all other types of art and especially to modern literature."

ادبی مورخین جو تنقید کی اہمیت کے منکر ہیں وہ خود غیر دانستہ طور پر نقاد ہیں۔ بالعموم وہ ناقدین جو دوسروں سے مواد حاصل کرتے ہیں اور جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں صرف روایتی جھنڈے لے رکھے ہیں اور

شہرتیں حاصل کر لی ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ وہ موخر رومانویت پسند ہیں جنھوں نے اپنے دماغ کے دریچوں کو فن کے دیگر اقسام کے لیے بند کر رکھا ہے بالخصوص جدید ادب کے لیے۔

۱۹ Lucien Goldmann: The Hidden God Page: 14

"It thus follows that the history of philosophy and literature can become scient ific only when an objective and verifiable instrument has been created which will enab le us to distinguish the essential from acc edental elements in a work of art; the valid ity of this method will be measured by the fa ct that it will never proclaim as accidental works which are aesthetically satisfying. In my view such an instrument is to be found in the concept of the world vi ion."

اس طرح یہ بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفہ و ادب کی تاریخ، اسی وقت سائنسی ہو سکتی ہے جب کوئی معروضی اور ایسا باوثوق ذریعہ پیدا ہو جائے جو ہمیں اس قابل کر سکے کہ ہم بنیادی عنصر کی تمیز حادثاتی عناصر سے ایک فن پارے میں کر سکیں اس طریقہ کار کی صحت اس حقیقت سے واضح ہوگی کہ یہ کبھی بھی ایسا حادثاتی فن پارہ ہونے کا اظہار نہیں کرے گی جو جمالیاتی اعتبار سے تشفی بخش ہو میرے خیال میں ایسا ذریعہ صرف ایک عالمی تصور میں پایا جا سکتا ہے۔

باب : دوم

برطانوی مستشرقین اور ان کی روایت

عام طور پر ہم مشرقی علوم یا ایشائی علوم میں دلچسپی رکھنے والے شخص کو مستشرق کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مشرقی علوم یا ایشیائی علوم گو کہ ایک دوسرے کا بدل نہیں پھر بھی ان میں بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ عموماً مستشرق وہ کہلائے گا جس کی دلچسپی مشرقی زبان اور ادب میں ہو۔ دوسرے علوم کی طرف جو زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی وہ انیسویں صدی سے کافی نمایاں نظر آتی ہے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستشرق وہ ہے جو اپنے علم کا آغاز کسی مشرقی زبان سے کرتا ہے اور جس کی دلچسپی آگے چل کر ایشیائی کلاسیکی کلچر یا ادب میں نمایاں ہوتی ہے۔ ایشائی عالم وہ ہوگا جو زبان و ادب کے علاوہ کسی ایک ایشیائی علاقے یا ملک کے مطالعے میں دلچسپی رکھتا ہے اور اس مخصوص علاقے کی زبان اس لیے سیکھتا ہے کہ وہ اس کے موضوع کے لیے ضروری ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علم مشرق (Oriental Studies) کا دائرہ ایشیائی حدود سے آگے بھی بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً سوویت روس کے وہ علاقے جو ایشیائی حدود سے باہر ہیں، وہ مستشرقین کی دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ دونوں

تہذیبی گروہوں میں بہت مماثلت رہی ہے۔

مستشرق کی تعریف کرتے ہوئے مشہور مستشرق اے۔جے۔آربری کہتا ہے کہ یہ ایسا میدان ہے جو کسی کا نہیں اور سب کا ہو سکتا ہے جس میں ماہرِ علم آثارِ قدیمہ، تاریخ نویس، ماہرِ علم اشتقاق، ماہر صوتیات، فلسفی، ماہرِ دینیات اور موسیقار سے لے کر فن کار تک، سبھی لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔[1]

اس لفظ کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ پہلی مرتبہ اس لفظ کا استعمال ایک مشرقی یا یونانی چرچ کے ممبر نے سنہ ۱۶۸۳ء میں کیا اور پھر سنہ ۱۶۹۱ء میں انٹونی ووڈ (Anthony Wood) نے سیمول کلارک (Samual Clark) کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک مشہور مستشرق (an eminent orientalists) کہا جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ کچھ مشرقی زبانیں جانتا تھا۔

مستشرقین سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے ہندوستانی علوم اور بالخصوص اُردو ادب کی تحقیق، تعلیم و تاریخ کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔

یوں تو ہندوستان اور یورپ کے باہمی تعلّقات بہت پُرانے ہیں لیکن سیاست اور تجارت کی بنا پر دونوں میں جو گہرا تعلّق پیدا ہوا اس نے یورپی علماء کو ہندوستانی علوم پڑھنے اور ہندوستانی زبانوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا موقع بہم پہنچایا اور اس طرح مشرق و مغرب میں تہذیبی لین دین کا ایک تاریخ ساز سلسلہ شروع ہوا۔ اس ضمن میں سر ولیم جونس (Sir William Jones) کی لسانیاتی دریافت سامنے آئی جس کے ذریعے وہ سنسکرت کو دنیا کی بیشتر زبانوں کا ماخذ قرار دیتا ہے اور مختلف زبانوں کو تقسیم کرکے ان کی درجہ بندی کرتا ہے۔

میکس مولر نے ہندوستانی ادبیات اور عقائد کا مطالعہ کیا اور گارساں دی تاسی نے فرانس میں بیٹھ کر ہندوستانی اور بالخصوص اُردو ادب کی سال بہ سال ترقی کا جائزہ لیا۔ اس طرح لسانیات، تہذیب اور ادب میں مستشرقین کی خدمات کی بدولت عالمی سطح پر علم میں اضافہ ہوا اور تہذیب کی تفہیم اور ادراک میں مدد ملی۔

مستشرقین میں دو قسم کے علماء تھے۔ اوّل وہ جن کا خیال تھا کہ صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس اور سائنسی ترقیوں کی بدولت انسانی تہذیب کا جو ورثہ یورپ کے ہاتھ آیا ہے اسے باقی دنیا تک پہنچانا یورپ کا تاریخی فرض ہے اور لبرلزم (libralism) کی اس تاریخی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے بنتھم (Banthem) اسٹورٹ مِل (Stuart Mill) اور ان سے متاثر ہونے والے دانشور اور سیاست داں یہ محسوس کرتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں نشاۃ ثانیہ کے خیالات اور تصورات عام کرنا اور عالمی تہذیب کے اقدار کو فروغ دینا ان کا فرض ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو انتظامی ضروریات کی بناء پر یہ محسوس کرتے تھے کہ محکوم قوم کے عادات واطوار، تہذیب وتمدن سے واقفیت بہم پہنچانا بہتر انتظام اور بہتر حکومت کے لیے ضروری ہے۔ ان میں وارن ہسٹنگز اور ویلزلی سے لے کر جان گل کرسٹ اور چارلس مٹکاف شامل ہیں۔

اس کے بر خلاف انگریزی سیاست دانوں اور اربابِ انتظام میں ایک ایسا گروہ شامل تھا جو محسوس کرتا تھا کہ ہندوستانی تہذیب سے واقفیت اور یہاں کے ادبیات پر عبور حاصل کرنا محض فضول ہوگا کیوں کہ اس صورت میں ہندوستانی، عالمی تہذیب کے بہتر تصورات سے آشنا نہیں ہوں گے اور اپنی پرانی دنیا میں کھوئے رہیں گے۔ اس طرزِ فکر کی بہترین نمائندگی لارڈ میکالے نے کی۔

برطانوی حکومت کے دوران جب ذریعۂ تعلیم پر بہت اختلافات پیدا ہوئے تو میکالے نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے (جو ہندوستانی علوم حاصل کرنے پر زور دیتے تھے) کہا کہ وہ ابھی تک مشرقی زبان کے کسی ایسے عالم سے نہیں ملا جو یہ ثابت کر سکے کہ مشرقی علوم کا سارا ذخیرہ، یورپ کے کلاسیکی ذخیرے کے ایک خانے کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔

آربری نے میکالے کے اس قول کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بات سچ مان لی جائے تو گویا اب تک برطانوی عالموں نے مشرقی ادب کے میدان میں جو کام انجام دیئے ہیں ان کا مقصد وقت ضائع کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

ان دونوں طرزِ فکر کا اظہار ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی پالیسیوں میں بھی برابر ہوتا رہا ہے۔ شروع میں ہندوستانی علوم پر زور دینے کی کوشش میں کلکتہ مدرسے کا قیام، فورٹ ولیم کالج، ہندو کالج اور دہلی کالج وجود میں آئے اور ان کے لیے نصابی کتابیں تیار کی گئیں اور تمام علوم و فنون کی تعلیم یہیں کی زبانوں دی جانے لگی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ عیسائی مشنریوں نے انجیل مقدس کے تراجم اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں شائع کیے اور اُردو کی قواعد و صرف و نحو کی کتابیں بھی تیار کی گئیں۔ لغات مرتب کی گئیں۔ مختلف یورپی زبانوں سے اُردو میں ترجمے کیے گئے اور اس کے لیے ذولسانی لغات تیار کی گئیں۔

مستشرقین نے اردو ادب کے مختلف نمونے یکجا کیے، آسان نثر کا اسلوب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں میر امن کی تصانیف خصوصاً باغ و بہار اور گل کرسٹ کی کوششیں اہم ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش اور اس ضمن میں گارساں دی تاسی کے خطبات و مقالات اور اس کی ہندوستانی

ادب کی تاریخ، اس کے اسپرنگر کے کیٹالاگ (شاہان اودھ کے کتب خانے) اور گل کرسٹ کے مضامین خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹوری (St-ory) کی مرتب کردہ فارسی ادب (Persian Literature)۔ تاریخ ادب اُردو کے سلسلے میں گراہم بیلی کی تصنیف اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی پہلی کوشش تھی۔

اس کے علاوہ مستشرقین نے دورِ حاضر میں بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی اور خصوصاً اُردو کو تجزیاتی بصیرت اور حکیمانہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں شمل، رالف رسل اور ڈیوڈ میتھیوز وغیرہ اہم ہیں۔

مستشرقین کی اس مختصر تعریف کے ساتھ ہمیں یہ بھی غور کرنا ہوگا کہ مختلف ادوار میں ان کے کارناموں اور دلچسپیوں کی نوعیت الگ الگ رہی ہے۔ عہدِ قدیم سے ہندوستان مختلف یورپی سیاحوں، مشنریوں اور تاجروں کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم زمانے سے یونانی اور ہندوستانی تہذیبوں کا میل رہا ہے۔ بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کی مشترکہ روایات دیکھنے کو ملتی ہیں اور اس کی اعلیٰ مثال حضرت سلیمان کی کہانی ہے۔ بدھ مذہب کی روایت کے مطابق جب دو عورتیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ بچّہ ان کا ہے تو دونوں کو اس بچے کو آدھا آدھا بانٹ لینے کا حکم ملتا ہے اور کھینچا تانی میں جب بچّہ درد سے چیختا ہے تو وہ عورت جو اصل میں بچّے کی ماں ہوتی ہے، بچّے کو چھوڑ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اسے بچّہ نہیں، بچّے کی زندگی چاہیے۔[۳] اس طرح کی بہت سی کہانیاں ملتی ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ مغرب و مشرق میں تہذیبی اقدار کی مشترک روایات رہی ہیں۔

لیکن اس دور میں تہذیبوں کے اس میل کی وہ شکل نہ تھی جو بعد کو

نظر آتی ہے. چاہے وہ چینی سیاح ہوان سیانگ ہو یا یورپی سیاح یا مورخ. ان کی دلچسپی کی اساس علم کی تلاش اور مختصراً علم برائے علم پر ہے. لیکن واسکوڈی گاما اور کولمبس کی آمد کے بعد سے ان کی دلچسپیوں میں تبدیلیاں آتی ہیں اور اب ان کی دلچسپیاں محض علم برائے علم تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان دلچسپیوں میں اضافہ ہوا. ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو جب واسکوڈگاما وارد ہندوستان ہوتا ہے اور اس کی آمد کا مقصد پوچھا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے کہ اس کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ و مسالوں کی تجارت ہے. یعنی اب نئے ممالک کی دریافت کے ساتھ اور نئے ممالک کی تہذیب و تمدن کے مطالعے کے نئے راستے ہموار ہونے کے ساتھ سلسلۂ تجارت کی بھی ابتدا ہوئی اور مستشرقین کے رویوں میں قدرے فرق آیا. لیکن ابھی بھی وہ پرانی قدریں باقی تھیں اور علمی مطالعے ابھی بھی اہم رول ادا کر رہے تھے. رالنس کے مطابق پہلا انگریز جو ۱۵۷۹ء میں گوا پہنچا وہ فادر ٹامس اسٹیونز (Father Thomas Stevens) تھا.[۴]

فادر ٹامس کی دلچسپی ایک مشنری میں ہونے کے باعث عیسائی مذہب کو فروغ دینے میں ہی تھی اس کا مقصد تاجرانہ قطعی نہیں تھا وہ پہلا مستشرق ہے جس نے مشرقی زبانوں میں دلچسپی لی اور ۱۶۱۵ء میں کوکنی بولی کی قواعد لکھی یہیں اس نے مراٹھی زبان سیکھی اور اس زبان کی بہت تعریف بھی کی اور کہا کہ "مراٹھی زبان خزف ریزوں میں موتی اور موتیوں میں زمرّد کی طرح ہے. گلوں میں یاسمین کی طرح اور خوشبو میں مانند مشک، پرندوں میں مور کی طرح اور ستاروں میں بروج جیسی"[۵]

ہندوستان اور برطانیہ کے تجارتی رشتے مغل سلطنت کے دور سے شروع ہو گئے تھے جب ۱۵۸۳ء میں انگریز تاجروں کی ایک ٹیم ملکہ الزبتھ — (Queen

Elizabeth) کا خط لے کر جہانگیر کے دربار پہنچی جو تر پولی اور بصرہ ہوتے ہوئے ہرمز پہنچے اور پرتگالیوں نے انھیں گرفتار کرکے گوا بھیج دیا۔ کسی طرح سے آزاد ہو کر یہ لوگ، رالف فِنچ (Ralf Fitch) جان نیوبری (John Newbery) اور ولیم لیڈز (William Leeds) ۱۵۸۵ء میں آگرہ کے دربار میں پہنچے اور بعد میں ان میں سے صرف فنچ برطانیہ واپس جا سکا۔ فنچ نے آگرہ شہر کو بہت خوبصورت اور بڑا بتایا ہے۔[۶]

۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو جہانگیر سے اس بات کی اجازت مل گئی کہ سورت میں تاپتی ندی کے کنارے ایک فیکٹری قائم کر سکیں اور یہیں سے انگریزوں کے پیر ہندوستان میں جمنے شروع ہو گئے۔

یہ سچ ہے کہ انگریزوں کی باقاعدہ آمد ہندوستان میں تاجروں کے طور پر تھی اور یہاں کی تہذیب و تمدن میں انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن ان میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو یہاں کی تہذیب و تمدن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ہندوستان کی زمین پر قدم بھی نہیں رکھا اور ہندوستانی کلچر کو اپنی تخلیق میں شامل کیا، ان میں جان ملٹن کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے جو کچھ دیکھ تو نہیں سکا لیکن سر ٹامس رو کے ذریعے حاصل کی ہوئی معلومات کی بنیاد پر انھیں اپنی شاعری میں شامل کیا۔[۷]

اس کے علاوہ ۱۶۷۵ء میں ڈرائڈن نے اپنے ڈرامے اورنگ زیب میں سترہویں صدی کے مغل دور کی تصویر کشی کی ہے جسے دو فرانسیسی سیاحوں تورنیر (Tavernier) اور برنیر (Bernier) نے اور آگے بڑھایا اور جن کا ترجمہ ۱۶۸۴ء میں انگریزی میں ہوا۔

یہ وہ دور ہے جب مشرقی ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کی نظر میں تاجرانہ

رتھیں۔ مشرقی علوم کا مطالعہ علم حاصل کرنے کی غرض سے ہو رہا تھا جن میں ملٹن اور میکسمولر (Maxmuller) جیسے علماء شامل تھے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستانی علوم و ادب کا مطالعہ جن یورپی علماء نے کیا ہے ان میں کچھ حد تک مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا دخل بھی رہا ہے اور اس دور میں زیادہ کام اگر ہوا ہے تو وہ عربی اور فارسی کے میدان میں ہوا۔ لیکن ایسا نہیں کہ ہندوستانی علم و ادب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد ایک طویل عرصے تک انگریزوں کا رویہ صرف زر حاصل کرنا تھا اور باقاعدہ طور پر یہاں کے تہذیب و تمدن اور تعلیم پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ ابھی تک انگریز یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں یہاں سے دولت حاصل کرنی ہے اور اس کے علاوہ ان پر کوئی اور ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ لیکن ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ان لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے بھی یہاں کی تہذیب کو سمجھنا ہوگا، ہندوستانیوں کو حکومت کا فرماں بردار بنانے کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا ہوگا۔ اس لیے اظہار و ابلاغ کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے پنڈتوں اور مولویوں کو ملازمت دی، انھیں ضروریات کی بناء پر ۱۷۸۱ء میں اسلامی تعلیمات کے لیے کلکتہ میں مدرسے کا قیام اور ۱۷۹۲ء میں بنارس میں سنسکرت کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ساتھ ہی ۱۷۹۲ء میں مدرسۂ غازی الدین جو بعد میں دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا، قائم ہوا۔ دہلی کالج کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ "دہلی کالج انگریزوں کی اس تعلیمی پالیسی کی بدولت وجود میں آیا جس پر مشرقی علوم کے حامی (Orientalists) عمل پیرا تھے اور جو اس وقت جنرل تعلیمی کمیٹی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یورپ میں ہندوستانی علوم

کی دید و دریافت کی بڑی قدر تھی۔ گوئٹے کے توصیفی اشعار سر ولیم جونس (Sir William Jones) کے تحقیقی مقالات اور ولیم رابرٹسن (William Robertson) کے تہذیبی انکشافات نے ان کی مقبولیت اور اہمیت کو بڑھا دیا تھا۔ بعض برطانوی حکمراں، ہندوستانی علوم کی سرد بازاری پر آزردہ تھے اور ان کا احیاء چاہتے تھے۔ لارڈ منٹو نے ۶؍ مارچ ۱۸۱۱ء کی یادداشت میں لکھا تھا کہ "ہندوستانی علوم کی تعداد گرتی جاتی ہے اور علم کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا ہے۔" اس پر کلکتہ ریویو کے مقالہ نگار نے طنز کیا تھا کہ "لارڈ منٹو کی یادداشت تمام ہندوستانی علوم کا مرثیہ ہے، اس میں ہندوستان کے عیسائی وائسرائے نے مغربی علوم کی حمایت میں ایک اشارہ بھی نہیں کیا۔"

انگریز یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہمیں ہندوستان کی حکومت تو مل گئی ہے لیکن ہندوستانیوں کی ہمدردی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کو یہ بھی خیال تھا کہ اگر ان علوم کی حمایت کی گئی جو اہلِ ہند کو بہت عزیز ہیں تو وہ "ان کی نگاہوں میں سرخرو ہوسکیں گے۔" اس لیے جنرل کمیٹی نے جو تعلیمی پالیسی بنائی وہ مشرقی علوم کی حمایت میں تھی۔ اس کے اراکین کچھ تو اپنے دامن کی تنگی کی وجہ سے، اور کچھ عقیدۃً یہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم سوسائٹی کے اونچے طبقے سے شروع کی جائے اور اس کے فوائد و برکات چھن کر طبقۂ ادنیٰ تک پہنچنے چاہئیں۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس طبقے کو رفتہ رفتہ مغربی علوم سے آشنا کیا جائے۔ اس لیے کہ اچھے نتائج مشرق و مغرب کے آمیزہ ہی سے مرتب ہوسکتے ہیں اور شاید اسی صورت میں ان ہندوستانی زبانوں کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے جو بعد میں ذریعۂ تعلیم بنیں گی۔ دوسرے، ہندوستان جیسے قدیم اور وسیع ملک میں مغربی آگاہیوں کی بنیاد صرف مشرقی علوم ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔" ؎

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں ہر طرح سے مضبوطی حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان پر حکمرانہ حیثیت حاصل کرنے کے بعد بھی ایسٹ انڈیا کمپنی بہت دنوں تک کوئی تعلیمی پالیسی نہیں بنا سکی لیکن بعد میں اُسے یہ ضرورت محسوس ہوئی اور یہ ذمّہ داری مشنریوں کے حصے میں آئی۔

ہندوستان میں انگریزوں کے ذریعے جو تعلیمی ادارے کھولے گئے ان میں پہلا اسکول ۱۷۸۰ء میں کلکتہ میں آرکر (Archer) نامی شخص نے قائم کیا۔ اس کے بعد ۱۷۸۵ء میں جان اسٹرانسبرو (John Stransberrow) نے مرزاپور میں ایک اسکول کھولا جس میں لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ ان تمام نجی اداروں کے علاوہ کمپنی کی ایما پر جو اسکول کھولا گیا وہ ۲۱ر دسمبر ۱۷۸۹ء میں فری اسکول سوسائٹی آف بنگال کے نام سے قائم ہوا۔ اس کی نگرانی کا کام کمپنی کے پادریوں کو سونپا گیا جس میں چھ کمپنی گورنر بھی شامل تھے اور گورنر جنرل کی حیثیت سرپرست کی تھی۔ ۲۸ر فروری ۱۷۹۰ء میں اسے چیریٹی اسکول سوسائٹی (Char-ity School Society) کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ یکم اپریل ۱۷۹۰ء میں اس ادارے نے کلکتہ میں مفت تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ اس میں سترہ لڑکے اور بارہ لڑکیاں اس وقت تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور دسمبر ۱۷۹۱ء تک ان کی تعداد پچاس لڑکے اور تیس لڑکیوں تک پہنچ گئی۔ [۹]

ہندوستانیوں کے درمیان تعلیم کا فروغ جو مشنریوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان کا بنیادی مقصد ہندوستانیوں کے درمیان عیسائی مذہب کی تبلیغ تک محدود ہو گیا۔ ڈی۔ پی سنہا کے مطابق ان میں سب سے اہم نام چارلس گرانٹ کا ہے جو ۱۷۶۷ء میں ہندوستان آیا اور بنگال میں بورڈ آف ٹریڈ کا چوتھا ممبر بنایا گیا۔ [۱۰]

وہ پہلے قمار بازی (gambling) کا شکار ہوگیا لیکن بعد کو اس نے ڈیوڈ براؤن سے یہ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ عیسائی مذہب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ ۱۷۸۶ء میں گرانٹ نے اس سلسلے میں ایک منصوبہ تیار کیا جس کی کاپیاں لندن بھیجی گئیں۔ اسی دوران سوسائٹی فار پرموشن آف کرسچن نالج کی کمیٹی نے کمپنی کو یہ تجویز بھیجی کہ جہاں جہاں کمپنی کی حکومت ہے وہاں انگریزی اسکول قائم کیے جائیں۔ گرانٹ نے یہ تجویز رکھی کہ انگریزی کی جگہ فارسی کو بڑھاوا دیا جائے کیوں کہ اس کے ذریعے اپنے مقصد کو اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جاسکتا ہے لیکن برطانیہ کی پارلیامنٹ نے یہ تجویز نامنظور کردی۔ پھر بھی کارنوالس کے بعد سرجان شورے جو گرانٹ کے خیالات سے متفق تھا اس نے اس سلسلے میں بہت دلچسپی لی۔ شورے کے بعد جب گورنر جنرل کا عہدہ ولزلی نے سنبھالا تو اس نے اس مشن کو آگے بڑھایا۔ ایک کٹر عیسائی ہونے کے باوجود ولزلی ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے محسوس کیا کہ اب کمپنی کا کام محض تجارت نہیں بلکہ ہندوستان پر حکومت بھی کرنا ہے اور جس کے لیے تربیت یافتہ افسروں (trained officers) کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جو افسر ہندوستان آتے ہیں وہ کم سن ہوتے ہیں اور ان میں عام معلومات کی بھی کمی ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے کمپنی کے افسروں کو باقاعدہ تربیت (trai-ning) دینے کا ارادہ کیا جو ہندوستان کے ماحول سے میل کھاسکے اور گل کرسٹ کا تقرر اسی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ بنگال میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اور بعد میں کالج بند کرنے کے حکم سے ولزلی چپ نہیں بیٹھا۔ فورٹ ولیم کالج کو بند کرنے کا حکم یا اس کی مالی امداد کم کرنے کے حکم سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اس وقت کمپنی کے حکام کے درمیان یہ مسئلہ بڑی سنجیدہ شکل اختیار کرچکا تھا۔ ایک گروہ وہ تھا جو ہندوستانیوں میں کسی بھی طرح کی تعلیمی کوشش ہی کے خلاف تھا

یا پھر ہندوستانی زبان وادب کے مطالعے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ دوسرا گروہ کمپنی کے اقتدار کو اور بھی مستحکم بنانے کے لیے ہندوستانیوں کی تعلیم پر کافی زور دے رہا تھا۔ اس طرح ایک گروہ جو مستشرقین پر مشتمل تھا ہندوستانی زبان وادب کی روشنی میں تعلیم دینے کی بات کرتا تھا۔ دوسرا گروہ انگریزیت پسندوں (Anglicists) کا تھا جو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا تھا۔

ہندوستان میں تعلیم کے سلسلے میں ابھی تک حکومت کی طرف سے کوئی باقاعدہ تعلیمی پالیسی وجود میں نہیں آئی تھی۔ تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ بھی کام ہو رہا تھا وہ یا تو کمپنی کے افسروں کی ٹریننگ یا مذہبی تبلیغ تک محدود تھا اور ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا تھا۔ پہلی مرتبہ ۶ ستمبر سنہ ۱۸۱۳ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو پارلیامنٹ کی طرف سے گورنر جنرل کو یہ ہدایات دینے کا حکم ملا کہ ہندوستانیوں کے درمیان تعلیمی مسئلہ پر غور کیا جائے جس میں یہاں کے مقامی تعلیم یافتہ باشندوں کی حوصلہ افزائی وادب کی فلاح و بہبود اور عوام میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا جائے۔ اس ضمن میں مختلف اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں نئی قسم یعنی جدید تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کی بات کی گئی۔ اسی بنا پر کچھ جگہوں پر ضلع اسکول کھولے گئے۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ، پٹنہ، مرشد آباد، بنارس، بریلی اور فرخ آباد میں تعلیمی کمیٹیاں وہاں کے مقامی افسروں کی نگرانی میں قائم کی گئیں۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ برطانیہ حکومت کی تعلیمی پالیسی میں صرف کرسچن مشنریوں کی مرضی ہی چلتی تھی، صحیح نہیں ہے۔ سر جارج بارلو (Sir George Barlow) اس طرح کی حرکتوں کے سخت خلاف تھا اور اس کا خیال تھا کہ مشنریوں کی

کارروائیاں ہندوستانیوں پر اچھا اثر نہیں چھوڑیں گی۔ اس نے عام جگہوں پر مذہبی تبلیغ اور گاؤں میں جاکر مذہبی پرچے تقسیم کرنے پر پابندی لگا دی۔ ایسا نہیں تھا کہ سر جارج بارلو یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستانی اپنا مذہب تبدیل کریں یا عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ ہو بلکہ بارلو جیسے لوگوں کا خیال تھا کہ مذہب تبدیل کرنے کی مہم دھیرے دھیرے چلائی جانی چاہیئے تاکہ مذہب بدلنے والا پوری عقیدت کے ساتھ عیسائی مذہب تسلیم کرے۔[۱۱]

بارلو کے بعد منٹو نے بھی وہی پالیسی اپنائی اور ہندوستان آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب اسے پتہ چلا کہ مشنریوں نے کوئی ایسا پرچہ فارسی میں چھاپا ہے جو اسلام کی سخت تنقید کرتا ہے اور جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں تو اس نے فوراً اس پرچے پر پابندی لگا دی یہاں تک کہ مشنریوں نے سیرم پور میں جو پریس قائم کیا تھا اسے کلکتہ منتقل کرنے کا حکم دیا۔

ان باتوں کے علاوہ ہندوستانیوں میں بھی ایک ایسا گروہ تھا جو محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستانیوں کی ترقی محض کلاسیکی تعلیم سے ممکن نہیں بلکہ انھیں جدید علوم سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ ان میں راجہ رام موہن رائے کا نام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے نہ صرف ایشیائی علوم بلکہ یورپی علوم کا بھی مطالعہ کیا اور اپنے تعلیمی مشن کو جدید طریقوں سے ہندوستانیوں تک لے جانے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں ان کی دوستی ڈیوڈ ہیئر (David Hare) سے ہوئی اور دونوں نے مل کر ۱۸۱۵ء میں ایک اسکول کھولنے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلے کی ایک میٹنگ گورنر جنرل کے ساتھ طے ہوئی۔ کٹر ہندوؤں کے ایک گروہ نے رام موہن رائے کو اس ادارے سے منسلک ہونے کی سخت مخالفت کی اور بالآخر انھیں اپنا نام واپس لینا پڑا۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنا نام واپس لے لیا،

گورنر جنرل نے طے شدہ پروگرام کے تحت میٹنگ منعقد کی اور اس طرح کی تعلیم دینے کا خیر مقدم کیا گیا جس میں کلکتہ کے بہت سے پڑھے لکھے ہندو حضرات شامل تھے۔ اس نوعیت کی تعلیم کے لیے کھولا گیا ادارہ اینگلو انڈین کالج بہت مقبول ہوا جس کی بنیاد ۲۰ر جنوری ۱۸۱۷ء کو رکھی گئی۔ اس اسکول کا بنیادی مقصد بنگالی اور انگریزی کی تعلیم کے علاوہ ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم جدید طریقوں سے دینا تھا۔

اینگلو انڈین کالج کے قیام کے باوجود راجہ رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیئر نے محسوس کیا کہ مقامی زبانوں میں تعلیم دینا بہت ضروری ہے اور راجہ رادھا کانت دیو کو ساتھ لے کر کلکتہ اور اس کے آس پاس کچھ مقامی اسکول کھولے جو کلکتہ اسکول سوسائٹی کی نگرانی میں لے لیے گئے۔

اس کے علاوہ جے نرائن گھوشال نے ۱۸۱۴ء میں حکومت سے درخواست کی کہ بیس ہزار روپیوں کی امداد انھیں اس لیے دی جائے تاکہ ان روپیوں سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا جا سکے اور یہ تجویز جولائی ۱۸۱۸ء میں منظور کر لی گئی۔ ڈی کوری (Rev.D. Corrie) جو کلکتہ چرچ مشنری سوسائٹی سے منسلک تھا اسے اس ادارے کا نگراں بنایا گیا جس میں انگریزی، فارسی، ہندوستانی اور بنگالی کی تعلیم دی جانے لگی۔ ۱۸۲۵ء میں اس ادارے کو دی جانے والی رقم میں بیس ہزار کا اور اضافہ کر دیا گیا۔[۲۱]

اسی دوران مشنریوں پر جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ اٹھالی گئیں جن کا مقصدِ تعلیم عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ ۱۸۱۵ء تک ان مشنریوں نے بنگال میں سو سے زیادہ ادارے کھول دیئے تھے۔ اب تک انھوں نے بنگال میں ایک اخبار "سماچار درپن" بھی نکالنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی حکومت نے یہ بھی محسوس کیا کہ اچھی تعلیم کے لیے مستند (qualified) اساتذہ کا ہونا ضروری ہے اور

اس طرح اساتذہ کی ٹریننگ پر بھی دھیان دیا گیا۔ ریورنڈ مے (Reverend May) جو لندن مشنری سوسائٹی سے تعلق رکھتا تھا اور ہندوستان میں اب تعلیم کے سلسلے میں نمایاں کام انجام دے رہا تھا، اس نے ۵ اکتوبر ۱۸۱۵ء کو اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے ایک اسکول کھولنے کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ ۱۸۱۷ء تک ایسے اسکولوں کی تعداد تینتیس ۳۳ تک پہنچ چکی تھی جن میں دو سو چھبیس ۲۶ اساتذہ اور دو ہزار پچاسی طلبا، تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۳

اگست ۱۸۱۸ء میں مے کا انتقال ہوا اور اب تک ایسے اسکولوں کی تعداد چھتیس ۳۶ تک پہونچ چکی تھی جن میں تین ہزار طلبا، تعلیم حاصل کر رہے تھے ۱۸۱۶ء میں چرچ مشنری سوسائٹی کے ایک رکن کیپٹن اسٹیورٹ (Capt. Stewa-rt) کی ایما پر بردوان اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مقامی اسکول قائم کیے گئے اور ۱۸۱۸ء تک ان میں ایک ہزار طلبا، تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ اسکول بہت مقبول ہوئے اور کلکتہ اسکول سوسائٹی نے اپنا ایک ناظم ۱۸۱۹ء میں بردوان بھیجا تاکہ وہ اسٹیورٹ کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ کم اساتذہ کے ذریعے زیادہ طلبہ کو کیسے تعلیم دی جا سکتی ہے جس کا خرچ دوسرے اسکولوں کے بہ نسبت آدھا ہوتا ہے۔ ۱۸۲۳ء میں کرسچن نالج سوسائٹی نے سرکل سسٹم (Circle system) اسکول رائج کیے۔ شروع میں اس کے تین حلقے ٹولی گنج، کاسی پور اور ہاوڑہ میں قائم کیے گئے۔ ہر حلقے میں تین معاون اسکول (anxiliary schools) تھے جو ایک مرکزی اسکول سے منسلک تھے ناظم مشنری کے علاوہ اسکول میں ایک گرو اور ایک سرکل پنڈت ہوتا تھا جو ایک کے بعد دوسرے اسکول کا دورہ کرتے تھے۔ ان اسکولوں میں الہامی کتابوں، قواعد، جغرافیہ فطری فلسفہ وحساب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اسی زمانے میں مڈلٹن (Middleton) جو کلکتہ کی سوسائٹی فار پروپگیشن آف دی گاسپل (Society forpropogationof the Gospel) کا پہلا بشپ تھا، سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچن نالج کی مدد سے مشنری کالج کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کالج کا مقصد یہاں کے مقامی لوگوں اور عیسائی نوجوانوں کو گرجا کے اصول و ضوابط کی تربیت دینا تھا تاکہ انھیں مذہبی تبلیغ کا کام سونپا جاسکے اور مذہبی عقائد کے مطابق اساتذہ تیار کیے جاسکیں۔ اس کالج کی بنیاد ۱۵ دسمبر ۱۸۲۰ء کو پڑی لیکن ۱۸۲۲ء میں مڈلٹن کی وفات تک کالج کی تعمیر کا کام مکمل نہ ہو سکا۔

اب تک جو اسکول کھولے جارہے تھے ان کی نگرانی کے لیے کوئی باقاعدہ تنظیم نہ تھی۔ ان کی نگرانی اور تعاون کی ضرورت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مارشمین (Marshman) نے اس طرح کی تجویز پیش کی اور ۱۸۱۷ء میں ساتھ ہندوستانی، یورپی اور مشنریوں کی کوششوں سے کلکتہ اسکول بک سوسائٹی (Calcutta School Book Society) کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مقامی لوگوں میں تعلیم کے ذریعے اخلاقی اور علمی سمجھ پیدا کرنا تھا۔[۱۴]

اس سوسائٹی کی انتظامی کمیٹی میں یورپی اور ہندوستانی ممبروں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ ۱۸۲۱ء تک اس سوسائٹی نے ایک لاکھ چھبیس ہزار چار سو چھیالیس کتابیں مختلف موضوعات پر شائع کیں۔ اسی دوران کمیٹی نے محسوس کیا کہ اتنا بڑا کام بغیر حکومت کے تعاون کے ممکن نہیں، اس لیے حکومت سے امداد کی درخواست کی گئی۔ اس ضمن میں حکومت نے سوسائٹی کو پوری طرح سے امداد دینا منظور نہیں کیا لیکن فوری طور پر سات ہزار کی رقم

اور پانچ سو روپیوں کی ماہانہ امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

اسکول بک سوسائٹی کی کامیابی اور تعلیم کے وسیع میدان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۸۱۹ء میں کلکتہ اسکول سوسائٹی (Calcutta School Society) کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد کلکتہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اسکول قائم کرنا اور اس مقصد کے لیے اساتذہ تیار کرنا جو تعلیمی معیار کو برقرار رکھ سکیں۔ اس سوسائٹی کی انتظامیہ کمیٹی تین اور ذیلی کمیٹیوں (Sub-committees) پر مشتمل تھی۔ پہلی ذیلی کمیٹی کا مقصد کچھ باقاعدہ اسکول کھولنا اور انھیں کامیابی کے ساتھ چلانا، دوسری کمیٹی کا کام مقامی اسکولوں کا قیام اور مقصد کے لیے عوام میں دلچسپی پیدا کرنا تاکہ وہ خود پہل کریں اور تیسری کمیٹی کا کام کلکتہ میں انگریزی اور دوسرے اعلیٰ علوم میں تعلیم کا انتظام کرنا تھا۔ سوسائٹی کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ اسی سال سوسائٹی نے تعلیم بالغان اور تعلیم نسواں کی مہم چلانے کا ارادہ کیا۔

سوسائٹی طلباء کو مقامی طور طریقوں پر تعلیم دیتی تھی اور ہوشیار طلباء کو چن کر انھیں انگریزی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کرتی تھی۔ ایک سال کے اندر ہی اندر سوسائٹی کی نگرانی میں دو ہزار آٹھ سو طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی سال سوسائٹی نے ایک انگریزی اسکول کھولا جس میں ایسے طلباء کو داخلہ دیا جاتا تھا جو بہت ذہین ہوتے تھے۔ اس طرح اس اسکول میں داخلہ پانا قابلیت کی سند تھی۔ سوسائٹی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کلکتہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے بہت سے اسکولوں نے درخواست کی کہ سوسائٹی انھیں اپنے الحاق میں لے لے۔ لیکن سوسائٹی نے یہ درخواستیں نامنظور کر دیں کیوں کہ پہلے وہ اس

طریقے کو مستحکم بنانا چاہتے تھے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد سوسائٹی کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور حکومت سے مالی امداد کی درخواست کی گئی جو حکومت نے منظور کر لی اور سوسائٹی کو چھ ہزار روپے سالانہ دینے کا فیصلہ کیا۔

سوسائٹی کی تعلیم نسواں کی مہم نے بہت مقبولیت حاصل کی اور کلکتہ اسکول سوسائٹی نے ۱۸۲۰ء تک ایسے پانچ باقاعدہ اسکول کھول دیئے تھے۔ اسی زمانے میں مشنریوں نے بھی تعلیم نسواں میں کافی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور کلکتہ میں نوعمر لڑکیوں کی سوسائٹی (Calcutta Female — Juvenile Society) نے اپنا نام بدل کر مقامی عورتوں کی تعلیم کی سوسائٹی (Society or Native Female Education) رکھ لیا۔ اس طرح ۱۸۲۳ء تک بنگال میں لڑکیوں کے بائیس اسکول چل رہے تھے جن میں چار سو لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔

ڈی۔ پی۔ سنہا کا خیال ہے کہ ابھی تک تعلیم کا کام مشنریوں کے ہاتھ میں تھا جن کا پہلا مقصد ہندو مذہب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنا تھا جس سے عیسائیت کی راہیں ہموار ہوسکیں۔ ۱۵ے۔ لیکن ان مقاصد کے باوجود تعلیم کا مسئلہ صرف اور صرف مشنریوں تک محدود نہ تھا اور حکومت اصولی طور پر اس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ برطانوی حکومت جو اب تک طرح طرح کی خانہ جنگی کا مقابلہ کر رہی تھی اب ان جھگڑوں سے آزاد ہو چکی تھی۔

۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیامنٹ نے ہندوستان میں تعلیم کے سلسلے میں جو قرارداد منظور کی تھی وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے اسے عملی شکل دینے کا ارادہ کیا۔ ۱۸۱۱ء میں منٹو نے جو دو سنسکرت کالج کھولنے کی تجویز رکھی تھی اس پر پھر سے غور کیا گیا اور محسوس کیا گیا کہ سنسکرت

کالج کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ طے پایا کہ اسی قسم کا ایک کالج کلکتہ میں کھولا جائے جس کا مقصد ہندوستانی علوم کے مطالعے کے ساتھ یورپی علوم کی تعلیم بھی دینا تھا۔ اس سلسلے کی ایک تنظیمی کمیٹی بنائی گئی جس کا سکریٹری کرنل پرائس (Col.Price) کو بنایا گیا اور پچیس ہزار روپیوں کی سالانہ رقم کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے کالج کی تعمیر کے لیے منظور کیے گئے۔ لیکن اب تک حکومت کی باقاعدہ تعلیمی پالیسی سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر بھی جو تعلیم دی جا رہی تھی وہ مشرقی طور طریقوں کو مدِ نظر رکھ کر اور علاقائی اثرات کے علاوہ یہ بھی دھیان رکھا جاتا تھا کہ ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے ان کی دلچسپی بنی رہے۔ اس ضمن میں ان کی نفسیات اور جذبات کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

میکنزی (H. Mackenzie) کی تجویز تھی کہ اخلاقی اور علمی میدان میں ہندوستانیوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ اس تجویز پر ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو گورنر جنرل نے غور کیا اور اس مسئلہ کو آگے بڑھانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ لیکن کمیٹی کے تمام ممبر حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز تھے اور ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ تعلیمی مسئلوں پر غور و فکر کر سکیں اس لیے ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۶ء تک کمیٹی کسی طرح کی پالیسی تیار نہ کر سکی۔ لیکن پھر بھی تعلیمی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اب زیادہ تر لوگ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ہندوستانیوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لیے انگریزی کی تعلیم ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر ایک انگریزی کالج کھولنے کی تجویز پیش کی گئی اور انگریزی کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر انگریزی تعلیم کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ۱۸۲۷ء سے کالج میں طبی کلاسیں (medi-

cal classes) شروع کر دی گئیں اور ۱۸۲۸ء میں طلبا، کی عملی ٹریننگ کے لیے ایک اسپتال کھولنے کی تجویز رکھی گئی جسے فنڈ کی کمی کی وجہ سے حکومت نے نامنظور کر دیا۔

اب تک دہلی، آگرہ اور بنارس و ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بہت سے تعلیمی ادارے کھل چکے تھے لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے یا انھیں علاقائی زبانوں تک محدود رکھا جائے۔ حکمراں طبقے میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو محسوس کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کو جدید علوم سے آگاہ کرنے کے لیے انگریزی کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۰ء کو ڈائریکٹرز نے ایک مراسلے میں یہ خواہش ظاہر کی کہ یہاں کے باشندوں میں انگریزی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔[۱۶]

ہندوستانیوں کی تعلیم کے سلسلے میں اہم موڑ ۱۸۳۵ء میں آتا ہے جب بنٹک اور میکالے کے نظریات تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں سامنے آتے ہیں بنٹک بنیادی طور پر اصلاح پسند تھا اور اس نے ہندوستان آکر جو کارنامے انجام دیئے وہ سبھی جانتے ہیں۔ بنٹک نے کلکتہ پہنچنے کے بعد دو اہم کارنامے جو تعلیمی میدان میں انجام دیئے وہ یہ کہ میڈیکل کالج کا قیام طور طریقوں کے مطابق (یعنی انگریزی ذریعۂ تعلیم) اور ولیم آدم (William Adam) کا تقرر کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں مقامی طور طریقوں سے تعلیم دینے کے امکانات کی نشاندہی۔

اسی زمانے میں بنٹک نے انگلو اورینٹل (Anglo-oriental) اختلاف جو وجود میں آئے انھیں ختم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آدم کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم مقامی طور طریقوں پر دی جانی چاہیے

لیکن میکالے اس کے سخت خلاف تھا۔ جب جنرل کمیٹی کسی فیصلے پر نہ پہونچ سکی تو یہ مسئلہ سپریم کورٹ گورنمنٹ کے سپرد کر دیا گیا۔

اس وقت تعلیمی پالیسی کو لے کر جو اختلافات زیرِ بحث تھے ان کی روشنی میں ۱۸۳۳ء میں جنرل کمیٹی نے یہ رائے دی کہ آگرہ کالج فنڈ کی بچی ہوئی رقم کو انگریزی تعلیم کے فروغ پر خرچ کیا جائے جو وہاں کی مقامی کمیٹی نے فوراً تسلیم کر لی اور مقامی کمیٹی کی گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نے مشورہ دیا کہ کالج سے سنسکرت اور عربی کی تعلیم ختم کر دی جائے کیونکہ اس سے وقت کی بربادی ہوتی ہے اور ایسی تعلیم پر جو وقت اور رقم خرچ ہوگی اسے انگریزی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ لیکن جنرل کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ ایسے اقدامات اتنی جلدی نہیں اٹھائے جانے چاہئیں حالانکہ جنرل کمیٹی کو آگرہ کمیٹی کی رپورٹ سے مکمل اختلاف نہیں تھا۔ جنرل کمیٹی نے یہ رپورٹ حکومت کو بھیج دی اور جواب میں حکومت مختلف تبدیلیوں کی نوعیت جاننا چاہتی تھی جس کی بناء پر جنرل کمیٹی نے مقامی کمیٹی سے تفصیل مانگی۔ مقامی کمیٹی نے جواب میں لکھا کہ اب تک کے تجربوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انگریزی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ مقامی ٹھاکر اور مالدار تاجر اپنے بچّوں کو انگریزی دلانے میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں بہ نسبت مقامی تعلیم کے۔ مقامی کمیٹی نے انگریزی تعلیم کی مقبولیت کے ثبوت کے طور پر کوٹا کے انگریزی اسکول کی مثال دی جسے ایک ہندوستانی نے کھولا تھا اور کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں دعویٰ کیا کہ انگریزی کی کتابوں کی فروخت دوسری زبانوں کی کتابوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اسی بناء پر سنسکرت اور عربی کی تعلیم ختم کر دینے کی تجویز پیش کی جسے جنرل کمیٹی نے غور کرنے کے لیے حکومت کے حوالے کر دیا۔

اس سے پہلے کہ آگرہ کالج کے مسئلے پر کوئی فیصلہ ہوتا، یہ مسئلہ کہ کلکتہ مدرسے کو انگریزی ادارہ بنایا جائے اٹھ کھڑا ہوا۔ ۲۶ر اپریل ۱۸۳۴ء کو مدرسے کی ذیلی کمیٹی (Sub-committee) کی میٹنگ نے یہ تجویز پاس کی کہ وقت آگیا ہے کہ اب کھل کر مدرسے میں انگریزی کی تعلیم دی جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اب انھیں طلباء کو وظیفہ (Scholarship) ملے گا جو عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کریں گے۔ ۱۷ اس میٹنگ میں پرینسپ (H.T. Prin-sep) جو خود ایک مستشرق تھا، اسے نہیں بلایا گیا۔ بعد میں اس نے بہت احتجاج کیا کہ ایسا ادارہ جو عربی زبان و ادب کی حوصلہ افزائی اور مشرقی علوم کو پھر سے زندہ کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا اسے انگریزی تعلیم کی درسگاہ میں تبدیل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس اقدام کو جلد بازی کا فیصلہ کہتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ یہ ان لوگوں کی سازش ہے جو کچھ دنوں بعد عربی زبان و ادب اور مشرقی علوم کو مردہ قرار دے کر ان کی تعلیم ختم کر دینا چاہیں گے۔ اس کمیٹی کی میٹنگ میں شیکسپیئر (Shakespear) موجود تھا۔ اس نے اس بات سے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ میٹنگ کے وقت برڈ اور کالون (Bird and Colvin) کے علاوہ اور کوئی ممبر کلکتہ میں موجود نہ تھا اور دونوں میں سے کسی کو اس تجویز سے اختلاف نہ تھا۔ لیکن مدرسہ کے سالانہ امتحانات کے جو نتیجے آئے ان سے اس تجویز کی ناکامی ثابت ہوئی کیوں کہ انگریزی کے نتیجے بہت خراب تھے۔ ان نتیجوں کا شیکسپیئر پر اثر پڑا اور اس نے یہ رائے دی کہ یہ مسئلہ جنرل کمیٹی کے سامنے لے جایا جانا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی ان کے خیالات (شیکسپیئر، کالون اور برڈ) میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا نہیں ہوئی۔ ۱۸ پرینسپ جو اس کمیٹی میں تھا لیکن اپنی تنہا رائے رکھتا تھا ان لوگوں سے مسلسل

اپنی اختلاف رائے کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی دلیل دی کہ ذیلی کمیٹی (Sub-committee) کو اپنی تجویز جنرل کمیٹی کے سامنے پیش کرنی چاہیئے اور ذیلی کمیٹی کو فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ پرنسپ ذیلی کمیٹی کی اس تجویز سے اتفاق کرتا تھا کہ طلباء کو انگریزی کی تعلیم دی جانی چاہیئے لیکن کالج میں انگریزی کی تعلیم کو لازمی بنا دینے کے سخت خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ویسی ہی بات ہو گی کہ میڈیکل کے طالب علم سے اس بات کی توقع کی جائے کہ وہ ڈرائنگ کے استاد سے بھی سبق لے تاکہ فنونِ لطیفہ کا عالم ہو سکے۔ ۹ل

بعد میں یہ مسئلہ جنرل کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جس میں شیکسپیئر اور پرنسپ کی کچھ مسئلوں پر مشترکہ رائے بھی شامل کی گئی کہ مسلمانوں میں ایسی دلچسپی پیدا کی جائے کہ وہ انگریزی کی تعلیم حاصل کریں۔

جنرل کمیٹی نے تعلیمی پالیسی کو لے کر اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ کمیٹی میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دے رہے تھے جن میں شیکسپیئر شامل تھا اور اس طرح مستشرقین اقلیت میں آ گئے۔ بعد میں اس مسئلے پر بہت طویل بحث چلی اور اسی دوران شیکسپیئر نے اپنا خیال بدل دیا اور مستشرقین میں شامل ہو گیا۔ اسی طرح کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مستشرقین سے الگ ہو کر اینگلسسٹ (Anglicists) میں شامل ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رائے دہندگی (Voting) کے وقت دونوں مکتبۂ خیال کے لوگوں کی تعداد یکساں تھی۔ ۲۰ل

بعد میں جنرل کمیٹی نے محسوس کیا کہ موجودہ تعلیمی پالیسی میں مکمل تبدیلی کی ضرورت ہے لیکن یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہو گیا تھا اور مستشرقین (Orientalists)

وائنگلسٹ (Anglicists) کی لڑائی اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ فوراً کوئی فیصلہ لینا آسان بات نہ تھی۔ اینگلسٹ اس بات کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور ذریعۂ تعلیم انگریزی کو قرار دیا جانا چاہیے۔ لیکن مستشرقین انگریزی کی تعلیم کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود بہتر یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کو جو بھی تعلیم دی جائے وہ ان کی مقامی زبانوں کے ذریعے دی جائے تاکہ انھیں سمجھنے میں دقت نہ ہو۔[۲۱]

یہی نہیں بلکہ اینگلسٹ (Anglicists) کا یہ بھی کہنا تھا کہ حکومت کا فرض ہے کہ ہندوستانیوں کے بیکار کے جذبات کے ڈر سے خاموش نہ بیٹھے بلکہ حکومت کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے (برطانوی) خیالات ان پر اثر انداز ہوں اور ہم انھیں حقیقت سے آگاہ کرائیں۔ ہندوستانیوں کو حقیقت سے تبھی روشناس کرایا جا سکتا ہے جب ہندوستانیوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ یورپی کلچر کو باقاعدہ تسلیم کریں۔ یعنی اینگلسٹ ہندوستان کی تمام قدیم روایات کو مردہ سمجھتے تھے اور ان روایات کے بنے رہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ مستشرقین کا کہنا تھا کہ ہندوستانیوں کو پورا حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ادب اور کلچر کا مطالعہ کر سکیں اور اس کے لیے انھیں ہر طرح کی آسانیاں مہیا کی جانی چاہئیں۔ جہاں تک یورپی حقائق کا تعلق ہے مستشرقین کا خیال تھا کہ اگر یورپی کلچر میں اتنی طاقت ہے تو یہ حقائق ہندوستانیوں پر خود بخود اثر انداز ہوں گے۔

زبان کے مسئلے پر بھی اینگلسٹ کا کہنا تھا کہ انگریزی ادب اور سائنس کی فہم ہندوستانیوں میں ان کی زبانوں میں ترجموں کے ذریعے بیکار ثابت

ہو گی۔ انھوں نے اس کی دو وجہیں پیش کیں۔ اوّل تو یہ کہ ترجموں کے کورس کا باقاعدہ انتظام بہت مشکل کام ہے۔ دوسرے یہ کہ ترجموں کے ذریعے اصل مقصد کی ترسیل ممکن نہیں ہو سکتی۔ مستشرقین کا کہنا تھا کہ ہندوستانیوں کو ان کے ادبی سرمائے سے الگ کر کے ان پر انگریزی لادنے سے وہ انگریزی نہیں سیکھ سکتے۔

ایلفنسٹن نے سفارش کی کہ سرکاری رقم کو ایسے کاموں میں نہیں لگایا جانا چاہیے جو بیکار ہوں اور اس کی مثال انھوں نے مستشرقین کے ذریعے پیش کی ہوئی تعلیمی پالیسی سے دی۔ لیکن مستشرقین کا خیال تھا کہ ہندوستانی علم و ادب کا برقرار رکھنا اور اس کی حوصلہ افزائی کرنا برطانوی حکومت کا فرض ہے۔ اس لیے کہ ان کاموں کے ذریعے ہندوستانیوں کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسی زمانے میں میکالے کو نسل آف ایجوکیشن (Council of Educ-ation) کا صدر بنایا گیا اس نے انگریزیت پسندوں کے خیالات کی وکالت کی اور مستشرقین کی دلائل کو سرے سے رد کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور عرب کا تمام ادبی سرمایہ بھی ایک اچھے یورپی کتب خانے کے ایک حصّے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔[٢٢] اس کے مطابق اس کا یہ مشاہدہ سنسکرت اور عربی ادب کے ترجموں کے مطالعے کی بنا پر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موجودہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی اور اس طرح انھیں کسی غیر ملکی زبان یعنی انگریزی کے ذریعے ہی تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے بارے میں اس کا یہ بھی خیال تھا کہ انھیں تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ایسے لوگ جو انگریزی تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے وہ ایک طرح سے تعلیم ہی سے نفرت کرتے ہیں

اس نے کہا کہ وہ لوگ جو سنسکرت اور عربی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان پر حکومت کو اچھی خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور دوسری طرف انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے اپنا خرچ خود اٹھانے کو تیار ہیں۔ ۲۳

مستشرقین کی مخالفت کرتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ حکومت نے اب تک ایک لاکھ روپے کی کتابیں مقامی زبانوں میں چھاپی ہیں لیکن عملی طور پر یہ ساری کتابیں بیکار پڑی ہوئی ہیں اور ان کتابوں کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف انگریزی کی کتابیں ایک سال میں آٹھ ہزار فروخت ہوئی ہیں جن سے نہ صرف چھپائی کی لاگت نکل آتی ہے بلکہ بیس فیصد فائدہ بھی ہوتا ہے۔

مستشرقین کا یہ خیال کہ قانون کے افسروں (Law Officers) کی ٹریننگ کے لیے اورینٹل کالج (Oriental College) ضروری ہے، میکالے نے کہا کہ لا کمیشن (Law Commission) کا کام ختم ہونے کے بعد کالج ختم کرنا پڑے گا جس پر بہت زیادہ خرچ آئے گا جو مناسب نہیں۔ ہندوستان کے مقدس ادبی سرمائے جو عربی سنسکرت میں ہیں ان کے مطالعے کے سلسلے میں اس نے کہا کہ ہمیں اس معاملے میں غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ اس نے اپنی بات منوانے کے لیے یہ بھی کہا کہ ہمیں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے بھی ہندوستانیوں کے درمیان کچھ نہیں کرنا چاہیے۔

تعلیم کے سلسلے میں میکالے کا رویہ بالکل تاجرانہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں میں تعلیم کی صرف اتنی ضرورت ہے کہ کچھ ایسے لوگ تیار کیے جاسکیں جو ہندوستانیوں اور حکمرانوں کے درمیان ذریعۂ ترسیل کا کام کرسکیں۔ ایسا طبقہ جو رنگ و روپ میں تو ہندوستانی ہو لیکن عادتیں

انگریزی ہوں"۔ ۲۴؎

میکالے کی تعلیمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں یہ بحث چل رہی تھی کہ ہندوستانیوں کو کون سی تعلیم دی جائے اور اس کا ذریعہ کیا ہو۔ لارڈ میکالے کا خیال تھا کہ ہندوستانی کلچر خرافات اور توہمات کا پشتارہ ہے اور وہ تاریخ جو تیس فٹ کے اونچے حکمرانوں سے بھری ہوئی ہے اور جن کا دورِ حکومت تیس ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے اور وہ جغرافیہ، جس میں تمام سمندر، دودھ اور شیرے کے ہیں، اس کا پڑھانا محض تضیع اوقات ہے۔ میکالے سیسل روڈز (Cecil Rhodes) کا ہمنوا اور ہم خیال تھا۔ ان دونوں کو برطانیہ کی مسیحائی کا یقین تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسی کے فیوض و برکات ہی سے یہ خدا کی مقہور اور تیرہ و تار سرزمین روشن ہو سکتی ہے۔ میکالے کے فکری محرکات میں برطانوی سرمایہ داری کی وہ سیاسی اور معاشی ضرورتیں اور مصلحتیں مستزاد تھیں جن کا تقاضہ تھا کہ ملک میں ہمدرد اہل کاروں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جائے جو نو آبادیاتی نظام کے قیام میں عیانت کر سکے"! جو خون اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز"۔ میکالے کو یہ بھی یقین تھا کہ اگر اس کی تعلیمی پالیسی پر عمل کیا گیا تو اس سے ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہو گا۔ اور انگریزوں کی لسانی، علمی اور مذہبی برتری کا سکّہ بیٹھ جائے گا۔

میکالے کی یہ تعلیمی یادداشت (۱۸۳۵) ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس موقعے پر ولسن (Wilson) نے بہت واویلا مچائی کہ یہ بڑا ظلم ہے کہ ہندوستانیوں کے ذہن کو ان کی تہذیبی بنیادوں سے محروم کردیا

جائے اور وہ اپنے فکر وخیال کے لیے ایک اجنبی ملک کے محتاج ہوجائیں جو سات سمندر پار واقع ہے۔ لیکن گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ نے اس یادداشت کو منظور کر لیا۔ مشرقی علوم کے حمایتیوں کو شکست ہوئی اور ہندوستان کی ثقافتی غلامی کا وہ دور شروع ہوا جو فوجی محکومی سے زیادہ گراں نشیں تھا۔ ۲۵؎

صرف یہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ دہلی اور بنارس کو چھوڑ کر جہاں بھی مقامی تعلیم حاصل کرنے کے ادارے ہیں انھیں بند کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس کی تجاویز نامنظور کر دی گئیں تو وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دے گا۔ حالانکہ بنٹنگ نے میکالے کی رائے سے اتفاق کیا لیکن اس مسئلے پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کیوں کہ پرینسپ اپنے خیالات کی وکالت پر اٹل تھا اور بحث جاری تھی۔ پرینسپ نے کہا کہ میکالے نے تعلیم کے تمام نشیب وفراز کو سمجھے بغیر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی میکالے میں ادبی سمجھ کی گہرائی نہیں ہے اس لیے اس کی سفارش کو منظور نہ کیا جائے۔ پرینسپ نے اس دعوے کو بھی چیلنج کیا کہ ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی اُمنگ ہے۔ انگریزی کتابوں کی فروخت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اوّل تو انگریزی کتابیں سستی ہوتی ہیں دوسرے یہ کہ بہت سی کتابیں عیسائی اور ان کے علاوہ مشنری اسکول خرید لیتے ہیں۔

ان مباحث کی روشنی میں ۷، مارچ ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے جو فیصلہ سنایا وہ اینگلسسٹ کے حق میں تھا جس میں کہا گیا کہ:

۱۔ برطانوی حکومت کا مقصد یورپی ادب وسائنس کی فلاح و

بہبود ہونا چاہیے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ رقم انگریزی کی تعلیم کی
طرف منتقل کر دی جائے۔

۲۔ مقامی علوم کی تعلیم کے لیے کھولے گئے کالج و اسکول بند نہ کیے
جائیں اور تمام اساتذہ و طلباء کو جو سہولتیں مل رہی ہیں انھیں جاری
رکھا جائے۔ ساتھ ہی گورنر جنرل نے تعلیم کے دوران طلباء کی مالی
امداد سے ناخوشی کا اظہار کیا۔

۳۔ مقامی زبانوں میں کتابوں کی چھپائی کے لیے جو رقم منظور کی گئی
تھی، جتنی کتابیں چھپ گئی ہیں، ان کے بعد کی چھپائی فوراً روک دی جائے۔

۴۔ اس تعلیمی پالیسی کو عمل میں لانے سے جو رقم بچے اس سے ہندوستانیوں
پر انگریزی ادب و سائینس کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے دی
جائے۔[۲٦]

اس فیصلے کے بعد مستشرقین خاموش نہیں بیٹھے انھوں نے اپنی مہم جاری رکھی
اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو بیدار کرنے کی کوشش
کی اور حکومت سے درخواست کی کہ گورنر جنرل کے فیصلے پر پھر سے غور کیا
جائے۔ اب تک بنٹنک اور میکالے کی تعلیمی پالیسی کے تجربے کئی جگہ ہو چکے
تھے اور اس پالیسی کی ناکامی حکومت پر عیاں ہو چکی تھی۔ ۲۴ رنومبر ۱۸۳۹ء
کو لارڈ آک لینڈ (Lord Auckland) نے اس پالیسی کو رد کر دیا اور
حکومت نے اعلان کیا کہ وہ سہولتیں جو میکالے کی سفارشات سے قبل مل رہی
ہیں پھر سے جاری کر دی جائیں گی۔ اس ضمن میں آک لینڈ (Auckland) نے
درمیانی راستہ اپنایا جس سے شیکسپیئر اور پرینسپ دونوں اتفاق کرتے تھے کہ
انگریزی اور مقامی دونوں قسم کے تعلیمی ادارے چلائے جائیں جن میں

یورپی ادب اور سائینس کو دھیرے دھیرے بڑھاوا دیا جائے اور کوئی چیز
طلبا پر زبردستی تھوپی نہ جائے۔

آک لینڈ نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے لیے باقاعدہ تعلیمی پالیسی کا
ہونا ضروری ہے اور اس طرح اس نے جنرل کمیٹی کو ہدایات دیں کہ اس سلسلے
میں رپورٹ تیار کرے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو آک لینڈ کی تجاویز و سفارشات
کی روشنی میں جو رپورٹ تیار کی گئی اس میں محسوس کیا گیا کہ اخلاقیات،
سیاست، معاشیات اور قانون کے لیے قابل پروفیسروں کا ہونا ضروری ہے
کیوں کہ اب تک ایسی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی اور فی الحال یہ
کورس اینگلو انڈین کالج (یا ہندو کالج) تک محدود رکھے جائیں۔ ساتھ ہی تعلیم
کو مقبول بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ اسکالرشپ کا انتظام کیا جائے۔
دوسرے یہ کہ ایک تعلیمی ادارے کا رابطہ دوسرے تعلیمی اداروں سے ہونا
چاہیئے اور یورپی علوم کی کتابوں کے تراجم مقامی زبانوں میں ہونے چاہئیں
تاکہ ہندوستانیوں کو ان علوم سے روشناس کرایا جا سکے۔ تعلیمی اداروں
کی نگرانی کے لیے انسپکٹر آف اسکولز اور کالج (Inspectors of
S hools and colleges) کا تقرر ہونا چاہیئے جو جون ۱۸۴۳ء میں عمل
میں آیا۔ انسپکٹر کی مندرجہ ذمہ داریاں ہوتی تھیں:

۱۔ ایسے ذرائع فراہم کرے کہ انگریزی کی تعلیم (Govt. Sem
inaries) سرکاری سیمینریوں میں دی جا سکے۔

۲۔ مقامی بولیوں کی سمجھ پر زور دیا جائے تاکہ طلبا و اساتذہ
کے درمیان افہام و تفہیم کی عدم موجودگی کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔

۳۔ ضلعی سطح پر تعلیمی ادارے کھولے جائیں جن میں مقامی تعلیم دی جا سکے۔

۴۔ مقامی تعلیم کے لیے تیاری اور ان کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے۔

۵۔ اور ہر جگہ باقاعدہ اور یکساں طریقۂ کار اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۸۴۲۔۴۳ء میں کونسل آف ایجوکیشن (Council of Education) نے حکومت سے درخواست کی کہ تعلیم کو سائنٹفک بنانے کے لیے سوئٹزرلینڈ (Switzerland) اور انگلینڈ England کی طرح نارمل اسکول کھولے جائیں اور یہ اسکول کھلنے سے پہلے دوسرے اسکولوں سے مشورہ ضرور کیا جائے۔

دوسرے سال ایجوکیشنل کونسل نے نارمل اسکول کھولنے کے ساتھ طبیعی فلسفہ (Natural Philosophy) کی سیٹ (Seat) اور شعبۂ تعمیرات (Department of Architecture) کھولنے کی سفارش کی جسے ہندو کالج سے جوڑ دینے کا مشورہ دیا گیا تاکہ وہاں اساتذہ کو ٹریننگ دی جاسکے۔ کونسل نے یہ بھی سفارش کی کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان کے کچھ علاقوں میں یونیورسٹیاں کھولی جائیں جو حکومت برطانیہ نے ۱۸۵۴ء میں تسلیم کر لیا اور کلکتہ، بمبئی و مدراس میں لندن یونیورسٹی کی طرز پر یونیورسٹیاں کھولنے کے احکام جاری کر دیئے گئے

حواشی و حوالے

له A.J. Arberry - British Orientalists - Page:7

Publisher: William Collins of London - 1943

"--- so that in this no man's land or, rather, everyman's land the orientalist joins forces with the archaeologist, the historian, the etymologist, the phonetician, the philosopher, the theologian, the musician and the artist."

اس طرح اس وسیع میدان میں ایک مستشرق، ماہر آثار قدیمہ، مورخ، انسّاب، ماہر صوتیات، فلسفی، ماہر دینیات، موسیقار اور فنکار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

۲ه Ibid Page : 8

"If the judgement were true, clearly we must deplore the time and energy wasted by our brilliant but misguided countrymen who have taken pride in their Orientalism. But it is,

of course, a partly malicious and, one fears wholly ignorant misrepresentation of the facts."

اگر یہ فیصلہ درست ہوتا تو ہمیں اس وقت اور اس قوت پر اظہارِ افسوس کرنا چاہیئے جس کو ہمارے روشن دماغ مگر گمراہ ہم وطنوں نے ضائع کیا اور جنھوں نے اپنے مستشرق ہونے پر فخر کیا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا ایک حصہ بدنیتی پر محمول ہے اور یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام کا تمام حقائق کی جاہلانہ غلط نمائندگی ہے۔

۳ہ Rhys Davis - Buddhist Birth Stories, I, XIII

۴ہ G.T. Garratt - Legacy of India - Page : 27 (India in European literature by H.G. Rawlinson) Oxford University Press, London - 1938

۵ہ Ibid Page : 27

"Like jewel among pebbles, sapphire among jewels, is the excellence of the Marathi tongue. Like the jasmine among blossoms, the musk among perfumes, the peacock among birds, the Zodiac among the stars, is Marathi among Languages.'

جس طرح خزف ریزوں میں موتی اور موتیوں میں زمرد ہے اسی طرح سے مرہٹی زبان کی اعلیٰ خصوصیات ہیں، جس طرح پھولوں میں یاسمن ___ خوشبویات میں مشک، طیور میں طاؤس اور ستاروں میں بروج اس

طرح سے زبانوں میں مرہٹی ہے۔

۶ـہ Ibid Page - 28

۷ـہ Ibid

"They chose

The figtree, not that kind for fruit renowned. But such as, at this day to Indian known, In Malabar or Deccan spreads her arms, Branching so broad and long, that in ground The bended twigs take root, and daughters grow About the mother, tree a pillared shade, High over-arched, with echoing walks between; These oft the Indian herdsman, shunning heat, Shelters in cool, and tends his posturing herds At loop-holes, cut through thickest shade."

انھوں نے چنا

انجیر کے درخت کو، پھلوں کی مشہور قسموں کو نہیں

بلکہ ایسے جو ہندوستان میں جانے جاتے ہیں

مالابار یا دکن میں اپنے بازوؤں کو پھیلائے ہوئے ہیں

اس کی شاخیں عریض و طویل ہیں جو زمین میں

اپنی جھکی ہوئی شاخوں کی جڑیں رکھتی ہیں اور لڑکیاں

اپنی ماں کے چاروں طرف نشو و نما پاتی ہیں، درخت ایک ستون والے سائے کی طرح تنا ہے

اونچا جس کے اوپر محراب نہیں ہوتی ہے اور جن کے درمیان گونجتے ہوئے راستے ہوتے ہیں
اکثر ہندوستانی گڈریے گرمی کو حقارت سے دیکھتے ہیں
ٹھنڈک میں پناہ لیتے ہیں اور اپنے چرتے ہوئے جانوروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں
ان سوراخوں میں سے جو بہت زیادہ گنجان سایوں کے اندر سے بنائے گئے ہیں۔

۸ھ صدیق الرحمٰن قدوائی ________ ماسٹر رام چندر
(مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی ________ ص ۱۵—۱۴)
ناشر: ___ شعبۂ اردو ___ دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء ___

۹ھ Hyde: Parochial Annals of Bengal - Page : 239

۱۰ھ D.P. Sinha: The Educational Policy of the East India Company in Bengal to 1854 - Page : 4 (Punthi Pustak, Calcutta - 1964)

۱۱ھ Ibid Page : 19

"Conversions, they believed, must necessarily be slow,"arising more from a conviction of the principles of our religion itself and from the pious example of the teachers" rather than from any interference of the state."

۱۲ھ S. Mahmud - English Education in India Page: 26

۱۳ھ D.P. Sinha: The Educational Policy of the East Indian Company in Bengal to 1854 Page: 42

۱۴ھ Ibid Page : 44

"--- to promote "the moral and intellectual improvements of the Natives by diffusion among them of useful elementary knowledge."

۱۵ھ Ibid Page : 47

"Thus the period between 1813 and 1821 saw the first signs of a wide-spread attempt to disseminate education among Indians and toacq-uaint with a knowledge of English language and literature. Hitherto educational activities had been confined to the Missionaries alone and th-ey had been actuated simply by a desire to de-stroy the founda- tions of Hinduism and to prepare the way for the reception of Chris tianity."

۱۶ھ Public Dispatch - 29th September 1830

(National Archives, New Delhi)

"It is of the greatest importance that to these and others of the native youths, the means should be afforded of cultivat-ing the English language and literature

and acquiring a knowledge of European science and familiarity with European ideas, in a higher degree than has yet been within their power."

[16] D.P. Sinha: The Educational Policy of the East India Company to 1854 Page : 180-81

"The Committee, being of the opinion that the time had arrived for encouraging openly and decidedly the study of English in the Madrassa. Resolved that from the present date no student be elected to a scholarship unless on the express condition of studying English as well as Arabic."

[18] Home, Public 30th July, 1834

(National Archives of India)

"--- the endowment took place nearly half a century ago, since which things have greatly changed, and it now appears to me that it is incumbent on us for the welfare of the Mohammedan students themselves to do all we can to prevail on them to qualify in English as well

as in Arabic, for most assuredly the time is approaching when their Law and Arabic literature will be of little use to them without it."

۱۹ Ibid 15th August 1834

"--- as if it were to be made a rule to refuse a degree to a student of medicine unless he attended the drawing master's lessons, the laudable purpose being to encourage of hight principles and independent minds, will be confined exclusively to the fawning, flattering sycophants who put their names down to the English class in order to carry favour with the powers that be."

۲۰ D.P. Sinha: The Educational Policy of the East India Company Page : 184

"--- but Shakespear soon changed sides and as the debates dragged on there were further defections on both sides, until when the voting took place there was a tie."

۲۱ Ibid Page : 184

"The Anglicists asserted "the paramount

value and obligation of communicating direct instruction in English literature and science in the seminaries of higher education. --- The orientalists professed their appreciation of "the importance of creating a taste for English science and literature among the Natives," which they hoped could not but "contribute to a wider diffusion of European knowledge in the vernacular dialects."

۲۲ ؎ Macanlay Minute

(Indian office library, London)

"--- a single shelf of good European Library was worth the whole Native literature of India and Arabic."

۲۳ ؎ "--- the people of India do not require to be paid for eating rice when they are hungry."

۲۴ ؎ Ibid

"We must at present do our best to form a class who may be interpreter between us and the millions whom we govern, a class of persons Indian in blood and colour, but English

in taste, in opinions, in morals and in-
tellect. To that class we may leave it to re-
fine the vernacular dialects of the Country,
to enrich those dialects with terms of scie-
nce borrowed from the Western nomenclature and
to render them by degrees fit vehicles for co-
nveying knowledge to the great mass of the
population.

۲۵؎ صدیق الرحمان قدوائی ــــــــ ماسٹر رام چندر
ص: ۲۲—۲۳

۲۶؎ Home - Public - Resolution - 7th March 1835
(National Archives of India)

باب : سوم

سرولیم جونس
گل کرسٹ
گریرسن
اور
گراہم بیلی کی ادبی خدمات

سر ولیم جونس

جونس کی تعلیم کا آغاز ریاضی سے ہوا ۔ اس میں بچپن سے ہی ادبی ذوق نمایاں نظر آتا ہے ۔ اس نے بہت کم عمری میں ہی نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں ۔

۱۷۶۴ء میں جونس نے یونیورسٹی کالج آکسفورڈ میں داخلہ لیا جہاں دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی مشرقی ادبیات میں بھی پیدا ہوئی ۔ اس نے یہیں عربی سیکھنی شروع کی ۔ اس نے تمام یونانی شعراء اور تاریخ دانوں کی تخلیقات اور افلاطون و لوسی (Lucian) کے کارناموں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان پر تنقیدی نوٹ تیار کیے ۔ اسی دوران اس نے مرزا نامی ایک شخص کو نوکر رکھا جس کے تعاون سے عربی کے ترجمے کئے ۔ اس سے پہلے اسے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ عربی اور فارسی ایک دوسرے سے کتنا قریب ہیں ۔ اس طرح اس نے سعدی کے گلستاں کا گہرا مطالعہ کیا ۔ گھر پر قیام کے دوران اس نے اطالوی، ہسپینی اور پرتگالی کا بھی مطالعہ کیا ۔ ۱۷۶۶ء میں گریفٹن کے ڈیوک کی طرف سے مشرقی زبانوں کے

(interpreter) کی پیش کش ہوئی جسے اس نے خندہ پیشانی سے نامنظور کر دیا۔

اپریل ۱۷۶۸ء میں C. REVICZKI کو وہ ایک خط میں حافظ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کی شاعری کو جتنی مرتبہ پڑھا جائے ہر مرتبہ ایک نیا خیال ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حافظ کی شاعری کے ترجموں اور اُن کی اشاعت کی وقت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "انھیں ویسی منظوم شکل دینا بڑا مشکل کام ہے"۔ اس نے اپنے بہت سے خطوط میں عربی اور فارسی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اکثر لکھتا ہے کہ اگر اس نے مشرقی ادب کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو بہت بڑے ادبی سرمائے سے محروم رہ جاتا۔

مشرقی ادب کی اسی دلچسپی نے جونس کو ہندوستان کی طرف کھینچا اور ستمبر ۱۷۸۳ء میں سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے کلکتہ وارد ہوا۔

ہندوستان آنے کے بعد اپنے ایک دوست کو خط میں یہاں کے ماحول اور لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی زبانوں کو سیکھنے کی دلچسپی کا ذکر کرتا ہے۔ اسی ضرورت کے تحت اس نے زین الدین نامی ایک بزرگ، جو شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے، کو مقرر کیا۔ اُن کی شاعری کے ترجمے وہ اکثر اپنے دوستوں کو بھیجا کرتا تھا۔

زبان کے اور جنرل فارم میں ہی جونس نے ہندوستانی اور دیگر مشرقی قوانین کا مطالعہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے سنسکرت پر عبور حاصل کرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ اسی زمانے میں (ستمبر ۱۷۸۶ء) اس نے سنسکرت کی کئی تخلیقات کا ترجمہ کیا ــــــ مندرجہ ذیل موضوعات جن پر وہ کام کرنا چاہتا تھا اور جو اس کی وفات کے بعد اس کے کاغذات

میں ملے وہ یوں ہیں!

INDIA

1. The Ancient Geography of India.
2. A Botanical Discription of Indian Plants from the Coshas.
3. A grammer of the Sanscrit Language from Panini.
4. Dictionary of the Sanscrit Language from thirty two original vocabularies and Niructi.
5. On the Ancient music of the Indiens.
6. On the medical substances of India and the Indian Art of Medicine.
7. On the Philosophy of Ancient Indians.
8. A Translation of Veda.
9. On the Ancient Indian Geometry, Astronomy and Algebra.
10. Translation of the Puranas.
11. Translation of the Mahabharata and Ramayan
12. On the Indian Theatre.
13. On the Indian Constellations, with their Mythology from the Puranas.
14. The History of India before the Mohammedan conquest the Sanscrit Cashmir Histories.

اس کے علاوہ عرب، ایران، چین اور تاتار سے متعلق نو مزید موضوعات ہیں جن پر وہ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوؤں کا ادبی ذوق بلند ہے اور وہ شاعری کو ایک devine art تصور کرتے ہیں۔ اس نے تقریباً تمام اُن تخلیقات کا مطالعہ کیا جو ہندو مذہبی عقائد سے متعلق تھیں۔ ان تخلیقات کا مطالعہ اس نے ہندوستانی کلچر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا اور ان کی فنکارانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا۔

جونس نے بہت سی تخلیقات کا ترجمہ بھی کیا۔ جن میں درگا، بھوانی، اندر، سوریہ، لکشمی، نرائن، سرسوتی اور گنگا سے عقیدت کا اظہار پراکرت میں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہندو سماج میں ان کی اہمیت اور رسم و رواج کا تفصیلی ذکر بھی کیا تاکہ یورپ کے لوگ یہاں کے کلچر اور رسم و رواج کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس نے رامائن، وید اور گیتا کا ترجمہ بھی کیا۔ اس میں گائتری منتر اور کالی داس کا ترجمہ کافی اہم ہے۔

گو کہ جونس جدید ہندوستانی زبانوں کے ضمن میں بہت زیادہ کام نہیں کر سکا اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں بھی جو دلچسپی کے موضوع ہو سکتے تھے وہ عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندو مذہبی عقائد سے متعلق چیزیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن جونس پہلا شخص ہے جس نے تمام ایشیائی زبان و ادب کا مطالعہ کیا اور ثابت کیا کہ تمام ایشیائی زبانوں کا ماخذ سنسکرت ہے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مخطوطے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو دیئے ان سے اس کی دلچسپی اور قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان مخطوطات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ مہابھارت (دو نسخے) ــــ سنسکرت میں۔

۲_ رامائن

الفؑ_ بالمیکی کی رامائن دیوناگری رسم الخط میں
ب _ بالمیکی کی رامائن بنگالی رسم الخط میں
ج _ بالمیکی کی رامائن دیوناگری رسم الخط میں جو نامکمل ہے۔

۳_ الفؑ_ سری بھگوت _ دیوناگری رسم الخط میں جس کا ترجمہ تامل، فرانسیسی اور فارسی میں ہے اور بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔
ب _ سری بھگوت کی دوسری کاپی جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔
ج _ پتوں پر لکھی ہوئی کاپی جو بنگالی رسم الخط میں ہے ۔

۴_ اگنی پران جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۵_ کالی پران جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۶_ الفؑ_ وایو پران جو دیوناگری رسم الخط میں ہے۔
ب _ یہ بھی اس کی دوسری کاپی ہے جو دیوناگری رسم الخط میں ہے۔

۷_ وربد ناردپران جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۸_ ناردپران جو دیوناگری رسم الخط میں ہے۔

۹_ الفؑ_ بھوشیوتر پران جو دیوناگری رسم الخط میں ہے۔
ب _ اس کی دوسری کاپی جو فہرست کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں ہے

۱۰_ گیتا گووند (گیت گووند) جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۱۱_ الفؑ_ کمارسمبھو جو دیوناگری رسم الخط میں ہے۔
ب _ دوسری کاپی بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۱۲_ نشادھ جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۱۳۔ بھٹی (Bhatti) جو بنگالی رسم الخط میں ہے۔

۱۴۔ رگھوونس ____ دیوناگری رسم الخط میں ہے

۱۵۔ وربہت کتھا ____ دیوناگری رسم الخط میں

۱۶۔ سنگھاسن ____ دیوناگری رسم الخط میں

۱۷۔ کتھاسرت ساگر ____ دیوناگری رسم الخط

۱۸۔ سک سپتاپی ____ دیوناگری رسم الخط

جونس کے مطابق فارسی میں طوطی نامہ اسی سے مستعار ہے۔

۱۹۔ رن منجری ____ دیوناگری رسم الخط میں

۲۰۔ شانتی ستک جو بنگالی رسم الخط میں ہے

۲۱۔ ارجن گیتا جو دیوناگری رسم الخط میں ہے

۲۲۔ ہتو پدیس جو بنگالی رسم الخط میں ہے

۲۳۔ برہمہ نروپن ____ دیوناگری رسم الخط میں

۲۴۔ میگھ ووت ____ بنگالی رسم الخط میں

۲۵۔ تنتر سار ____ بنگالی رسم الخط میں

۲۶۔ سہرنامہ ____ دیوناگری رسم الخط میں

۲۷۔ کیرتارجنیہ ____ بنگالی رسم الخط میں

۲۸۔ سدھانت سرومنی ____ دیوناگری رسم الخط میں

۲۹۔ سنگیت نارائن ____ دیوناگری

۳۰۔ وربدرانایکا Vrihadaranayca دیوناگری

۳۱۔ نرکتی ____ دیوناگری

۳۲۔ ماگھ ٹیکا ____ دیوناگری

۲۳_ چنداربی ______ دیوناگری

۲۴_ راج بتبھ ______ بنگالی

۲۵_ ہٹھ پردیپک ______ بنگالی

۲۶_ الف _ مانو دھرم شاستر ______ دیوناگری

ب _ دوسری کاپی ______ دیوناگری

۲۷_ مگدھ بودھ ٹیکا ______ بنگالی

۲۸_ سرسوتی ویاکرن ______ دیوناگری

۲۹_ سرسوتی ______ بنگالی

۳۰_ سدھانت چوندی ______ دیوناگری

۳۱_ الف _ امرکوش ______ دیوناگری

ب _ " ______ "

ج _ " ______ بنگالی

۳۲_ میدنی کوش ______ دیوناگری

۳۳_ وسوپرکاش کوش ______ دیوناگری

۳۴_ سبدسندربھ سندو ______ (دو جلدیں) دیوناگری

۳۵_ وینی سرہارا ______ بنگالی

۳۶_ مہا ناٹک ______ بنگالی

۳۷_ شکنتلا (جونس نے اسے انگریزی ترجمہ بھی کیا) بنگالی

۳۸_ مالتی اور مادھو (مدھومالتی) بنگالی

۳۹_ ہسیارنو ______ بنگالی

۵۰_ کوتکا سروسوم ______ بنگالی

۵۱ـ چندر بھتیکا ــــ بنگالی

۵۲ـ رتناولی ــــ بنگالی

۵۳ـ وکرم اوروسی ــــ بنگالی

۵۴ـ مانوک اگنی مترا ــــ بنگالی

۵۵ـ سنسکرت کتابوں کا ایک کیٹلاگ۔ دیوناگری

۵۶ـ گیتا اور دھرم ساشن ــ دیوناگری

۵۷ـ رگھوونش ــــ بنگالی

۵۸ـ پربدھ چندرودیہ ــ بنگالی

۵۹ـ گلستاں کا ہندوستانی ترجمہ

۶۰ـ سکھوں کے مذہب کے بارے میں معلوماتی کتاب ــــ دیوناگری

جے۔ بی۔ گل کرسٹ

۱۷۵۹ء میں ایڈنبرا (Edinburgh) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے جارج ہیریٹ اسپتال (George Hariot Hospital) میں تعلیم حاصل کی۔ عتیق صدیقی کے مطابق "اس بیان سے ہم کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی طبی سند بھی لی تھی یا نہیں؟ اور اگر کوئی سند اس نے لی بھی تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی؟۔۔۔ کسی جگہ بھی اس کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ نظر نہیں آتا" ۔ ۱؎

اس کے خود کے بیان کے مطابق تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک قسمت آزما کی حیثیت سے چند سال ویسٹ انڈیز (West Indies) بسر کیے اور ۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوا ـــــــــ "۱۷۸۲ء میں بمبئی وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت نہ تو میرے ہی لیے خوشگوار ہو سکتا ہے اور نہ ہی میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دستگاہ میں نہ حاصل کر لوں، جہاں عارضی طور پر مجھے قیام کرنا ہے۔ چنانچہ اس زبان کو، جسے اس زمانے میں مورس (Moors) کہتے تھے، سیکھنے کے لیے

جم کر بیٹھ گیا"۔[۲]

بمبئی پہنچتے ہی گل کرسٹ کو ملازمت بھی مل گئی اور "ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) کی فوج میں وہ اسسٹنٹ سرجن مقرر ہو گیا"۔[۳]

گو کہ تحقیقات سے ہم کو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے کوئی طبی سند لی تھی یا نہیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ اور دیگر ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ وہ کمپنی کی فوج میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوا اور یہ تقرر بغیر کسی طبی سند کے ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس کوئی اعلیٰ سند نہ رہی ہو لیکن کوئی ایسی سند ضرور رہی ہو گی جس کی بنا پر اسے سرجن مقرر کیا جا سکے اور جو اس نے جارج ہیریٹ اسپتال سے حاصل کی ہو گی۔

فوج کے جس دستے سے اس کا تعلق تھا اس نے ایک نومبر ۱۷۸۳ء میں فتح گڑھ کی طرف کوچ کیا اور اس طرح گل کرسٹ ایک ایسے علاقے میں پہنچ جہاں ہندوستانی زبان پر کام کرنے کے بہتر ذرائع دستیاب ہو سکتے تھے۔

فتح گڑھ کے قیام کے دوران اس نے ۲ جنوری ۱۷۸۵ء کو ایک سال کی چھٹی کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ اس دوران اس نے لکھنؤ، فیض آباد، الہ آباد، جون پور، بنارس اور دیگر مقامات کا دورہ کیا۔ اسی دوران اس نے ہندوستانی زبان کا علاقائی جائزہ لیا اور یہ ہندوستانی قواعد اور لغت کی فراہمی کے لیے بھی مفید ثابت ہوا اور بہت ہی کم عرصے میں اس نے مندرجہ ذیل تصنیفات شائع کیں:

1. English and Hindustanee Dictionary (1786-1790)

2. A Grammar of the Hindustani Language (1796)

3. The Appendix (1798)

4. The Oriental Linguist (1798)

۱۷۸۵ء کے اواخر میں گل کرسٹ بنارس سے کلکتہ کے روانہ ہوا۔ کلکتہ منتقل ہونے کے بعد ۲۱ جنوری ۱۷۹۹ء کو اس نے ویلزلی کی ایما پر اورینٹل سیمنری (Oriental Seminary) قائم کی جس میں جونئر سول سرونٹس (Junior Civil Servants) کو ہندوستانی وفارسی کا درس دیا جاتا تھا۔ علمی اعتبار سے گل کرسٹ کے اس مدرسے سے ہی فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑ گئی تھی۔

گل کرسٹ کی قابلیت اور ہندوستانی زبان میں افسروں کو درس کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ۴ جون ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ گل کرسٹ کی قابلیت اور کارناموں کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے جگہ جگہ اسے فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل لکھا ہے۔ لیکن کالج کے اس عہدے کے لیے ایک شرط یہ تھی کہ کالج کا پرنسپل یا پرووسٹ (Provost) ہونے کے لیے انگلستان کے کلیسا کا پادری (Clergyman) ہونا ضروری تھا اور اس طرح کالج کا پہلا پرنسپل ڈیوڈ براؤن (David Brown) مقرر ہوا جو فورٹ ولیم کا پادری تھا اور کلکتہ بائبل سوسائٹی (Bible Society) کا بانی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گل کرسٹ کا تقرر ہندوستانی پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ لوگوں نے جو تاریخی غلطیاں کی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ علمی اعتبار سے گل کرسٹ نے جو نمایاں رول ادا کیا وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتا۔ یہ گل کرسٹ کا زمانہ تھا کہ "جتنا کام خود اس نے کیا اس سے کہیں زیادہ اس نے دوسروں سے کام لیا۔" [۴]

ہندوستانی شعبے کے لیے اس نے ایسے منشیوں کا تقرر کیا جو ادبی اور علمی

اعتبار سے اس سماج میں اہم مقام رکھتے تھے۔ ان میں میر امّن، بہادر علی حسینی، مظہر علی ولا، شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری، للو لال اور سدل مشرا شامل ہیں۔
ان بزرگوں سے گل کرسٹ نے مختلف زبانوں کی کتابوں کے تراجم کرائے۔ ظاہر ہے ان تراجم کی حیثیت محض تراجم کی نہیں بلکہ آج بھی ہندوستانی ادب میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔
گل کرسٹ کی تصنیفات اور کارناموں کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ اس دور کا بہت ہی مختصر سیاسی اور سماجی جائزہ لیا جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزوں کی حیثیت اب تاجروں کی نہ رہ کر حکمرانوں کی ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے حکمراں کی حیثیت ہو جانے کے بعد اب عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو انھیں کی زبان میں اظہار و ترسیل کر سکیں۔ بقول ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی : ۵

" The Commerce Oriented rule reflected itself in all matters, social, political and economic, and played an important part in determining the relationship betw een the Englishmen and Indians"

اظہار و ترسیل کے مسئلے کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اور گل کرسٹ کی کوششوں کی بنا پر اورینٹل سمینری (Oriental Seminary) کا قیام انھیں ضروریات کی نشاندہی کرتا ہے۔ انھیں ضروریات کے تحت ۲۱ر دسمبر ۱۷۹۸ء میں گورنر جنرل نے حکم جاری کیا کہ پہلی جنوری ۱۸۰۱ء سے کوئی ملازم، ملازمت کے لایق نہیں سمجھا جائے گا جو یہاں کے قوانین اور فارسی و ہندوستانی

زبان کی جانکاری نہیں رکھے گا۔ ۶ے

یہ ادارہ جو سول سرونٹس (Civil servants) کی ٹریننگ کے لیے قائم کیا گیا تھا عملی طور سے یہاں ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی، کچھ عرصے بعد یہاں بنگالی زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ گل کرسٹ کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ منشی بھتہ (Moonshee allowance) جو انگریزی ملازمین کو ملتا تھا وہ گل کرسٹ کو دیا جائے گا۔ یہ طلبا، گل کرسٹ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کی روزمرہ کی رپورٹ گورنر جنرل کو بھیجی جاتی تھی تاکہ اسے ادارے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

گل کرسٹ کی قابلیت اور محنت سے متاثر ہو کر ویلزلی نے ایک بڑے ادارے کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا جس میں مختلف قسم کی تعلیم کا انتظام کیا جا سکے اور تھوڑے ہی دنوں بعد فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا لیکن کالج بہت دنوں تک نہ چل سکا۔ کیونکہ کورٹ آف ڈائرکٹر (Court of Director) اس قسم کے ادارے پر ایک کثیر رقم صرف کرنے کے حق میں نہیں تھا اور اس کا خیال تھا کہ ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیے کچھ مہینوں کی ٹریننگ کافی ہوگی جس کے لیے اتنے بڑے کالج کی ضرورت نہیں ہے۔ ویلزلی کے اس خیال کو غلط سمجھا گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ بجائے اس کے کہ کمپنی کی آمدنی بڑھائی جائے، ویلزلی فضول خرچی کی طرف آمادہ ہے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے کالج بند کرنے کا مشورہ دیا۔ ویلزلی نے کالج بند نہ کیے جانے کے سلسلے میں کئی دلائل دیے لیکن جب اس کی بات نہیں مانی گئی تو اس نے گورنر جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۷ے

اسی ضمن میں ڈاکٹر قدوائی نے لکھا ہے کہ: ۸ے

"A highly sophisticated system of Education

designed to inculcate superior intellectuals and moral qualities was beyond the appre ciation of the Directors, simply because the correction of morals and creation of hi gher values of head and heart was not their obligation. They were concerned with such things only to the extent they were useful for their trade."

یہاں اس بات کا بھی ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کالج بند کرنے کی وجہ محض مالی دقت بتائی گئی جبکہ ویلزلی نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ کالج پر خرچ ہونے والی رقم کا انتظام وہ خود دیگر ذرائع سے کرے گا۔ اور جس کا ایسٹ انڈیا کمپنی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ کورٹ آف ڈائرکٹر کی منظوری کے بغیر اس نے کالج کے قیام کا اعلان کر دیا۔ [۹]

یہاں چونکہ گل کرسٹ کے کارناموں پر بحث کی جارہی ہے اس لیے مندرجہ بالا موضوع پر تفصیلی بحث مناسب نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ حکمراں طبقے کو تحصیل زر کے علاوہ کسی اور چیز کو اہمیت دینے میں دلچسپی نہیں تھی اور کورٹ آف ڈائرکٹر کی رائے کا احترام کرتے ہوئے ۲۴ رجون ۱۸۰۲ء کو ویلزلی نے کالج بند کرنے کا حکم جاری کیا۔

اتنی تھوڑی مدت میں ہی کالج میں جو کام ہوئے وہ گل کرسٹ کی کوششوں کا نتیجہ کہے جاسکتے ہیں۔ ۱۸۰۳ء تک کالج سے چھیاسٹھ کتابیں شائع ہوئیں جن ۲۹ کتابیں اردو میں تھیں۔ ان میں باغ و بہار، اخلاق ہندی، باغ اردو،

نثر بے نظیر، مرثیہ مسکین اور طوطا کہانی وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ چودہ کتابیں زیرِ اشاعت تھیں۔ جب تک گل کرسٹ کالج سے منسلک رہا تب تک تقریباً ساٹھ کتابیں اردو میں چھپ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ تیرہ کتابیں جو گل کرسٹ نے چار سالوں میں لکھیں وہ بھی منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ جہاں تک ہندوستانی زبان و ادب سے گل کرسٹ کی دلچسپی کا سوال ہے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا مناسب نہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ بھی تاجرانہ ذہنیت کا مالک تھا لیکن جو ادبی کارنامے اس نے انجام دیئے ہیں ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی نیت پر سوالیہ نشان لگانا حق بجانب نہیں۔

گل کرسٹ نے ہندوستانی قواعد و لغت کا کام ایک جگہ بیٹھ کر نہیں کیا بلکہ اس نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ مختلف علاقوں کا دورہ کر کے زبان کے علاقائی استعمال اور ہیئت کا جائزہ لیا جائے اور جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ کمپنی سے چھٹی لے کر اس نے ان تمام اہم علاقوں کا دورہ کیا جو ہندوستانی زبان کے اہم مرکز تھے۔ لیکن وہ اس بات کو قلم بند کرنا بھول گیا کہ ان علاقوں کا دورہ کرتے وقت وہ کن کن علماء سے ملا۔ اس کے سامنے دقت یہ تھی کہ وہ کسی لغت یا قواعد کا سہارا نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے مختلف الفاظ کو اہلِ زبان کی زبان سے ادا کروایا اور نوٹ کیا۔ ۱۰ھ انھیں خوبیوں کی بناء پر گل کرسٹ نہ صرف ایک قواعد داں یا اچھا لغت نویس Lexicographer ثابت ہوا بلکہ اُس نے ایک بہترین اردو مدرس بھی حیثیت حاصل کی۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ٹھیک ہی لکھا ہے: ۱۱ھ

"Infact, all that gilchrist contributed to the Urdu studies was motivated by one sin-

gle objective i.e. the teaching of Urdu to Englishmen, and real worth of his grammer, dictionary and other works can be judged only in this context".

اس نے زبان سیکھنے کے سلسلے میں دو باتوں پر زور دیا۔ اوّل الفاظ اور دوسرے الفاظ کا صحیح استعمال۔ اورینٹل لنگوسٹ Oriental Linguist میں اس نے لکھا ہے۔[۱۰]

"---two things are chiefly to be considered in the learning of language; first. the words, then using those words conformable to the genius of the language. The one is the object of memory, the other judgement and reflection. The learning of words is nothing less than getting by heart the whole dictionary of a Language and can not be performed within a small compass of time, even by the best memory. That youth was ever blessed with. The right placing and using words in speech, require a constant and steady application of the minds and can not be acquired, but by much meditation up-

on the language, either by oneself, or with a teacher, by frequent construing and turning that language into our mother-tongue and vicissim our mother- tongue into that language, and comparing all along the genius and idiom of the two languages".

گل کرسٹ ایک قواعد داں ہونے کے ساتھ ساتھ زبان سیکھنے میں صرف قواعد ہی نہیں بلکہ سماج میں زبان کے استعمال پر بھی زور دیتا ہے۔ (ظاہر ہے انھیں بنیاد پر اس نے قواعد اور لغت بھی مرتب کی تھی)۔ وہ منشیوں سے بات چیت کے علاوہ گھر کے نوکروں سے بھی زبان سیکھنے کی کوشش کرتا ہے جو بعد کو زبان کی تعلیم میں بھی کارگر ثابت ہوئے۔ اور اس طرح قواعد کو روزمرہ کے استعمال سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔

زبان سیکھنے کے سلسلے میں جو طریقۂ کار گل کرسٹ نے سامنے رکھا وہ یوں ہے:

۱۔ کورس میں قواعد شامل کی جائے اور اس کی وضاحت مسکین کے مرثیے کی مدد سے کی جائے۔ شروع سے ہی بات چیت اور لب و لہجے پر خاص توجہ دی جائے۔

۲۔ اورینٹل لنگوسٹ Oriental Linguist کی مدد سے پہلے سیکھی ہوئی چیزوں کی اور بھی اصلاح کی جائے اور بولی جانے والی زبان کے مختلف طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ نثر و نظم کا علم ترجمہ، تشریح، محاروں سے واقفیت، کہاوتیں اور قواعد کی مشق کرائی جائے۔

۳۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو سے ترجمے کرائے جائیں۔

۴۔ اردو نثر و نظم کو بلند آواز میں پڑھایا جائے۔

۵۔ منشی کی مدد سے صوتی مشقیں کرائی جائیں۔ کچھ خاص آوازیں جیسے ق، غ، خ وغیرہ کو ادا کرنے کی مشق کرائی جائے۔ آوازوں کا علم ہونے سے پہلے شروع میں ان کی جگہ دوسرے حروف جیسے g یا k بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

۶۔ حرف عطف conjunction اور ان کی مشق۔

۷۔ رومن رسم خط میں لکھے ہوئے متن کو سامنے رکھ کر منشی انھیں کس طرح ادا کرتا ہے بغور سنا جائے جس سے علاقائی لب ولہجہ اور تلفظ سے کانوں کو مانوس کرایا جائے۔

۸۔ اور پھر اردو رسم الخط کی ٹریننگ دی جائے۔ ۱۳

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ گل کرسٹ کے طریقے کے مطابق رسم خط سیکھنے کا مسئلہ سب سے آخر میں آتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر شروع سے طلبار کو رسم خط سکھانے کی کوشش کی گئی تو وہ گمراہ ہو سکتے ہیں اور زبان سیکھنے کا راستہ اور مشکل ہو جائے گا۔ ساتھ ہی ابتدا میں طلبار کو اتنی زیادہ محنت نہ کرائی جائے کہ پریشان ہو کر ان کی دلچسپی ختم ہو جائے۔ اس کے علاوہ گل کرسٹ نے رسم خط کے سلسلے میں رومن رسم خط کو اہمیت دی کیونکہ اردو سیکھنے والا انگریز پہلے سے اس رسم خط سے واقف ہوتا ہے۔ اور کچھ مخصوص آوازوں کے لیے (جن کا رومن میں کوئی تصور نہیں ہے) اس نے اپنی مخصوص علامتیں تجویز کیں۔

ڈاکٹر قدائی کے مطابق گل کرسٹ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ طلبار اس طرح کے مشکل طریقوں سے پریشان ہو سکتے ہیں اور آسان سے آسان تر طریقے کی تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح کے طریقوں سے دور رہنے کا مشورہ دینے کے ساتھ

ہی گل کرسٹ نے طلباء کی نفسیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اورنٹل لنگوسٹ Oriental Linguist لکھی۔ جو ڈاکٹر قدوائی کے الفاظ میں ہندوستانی کے استاد اور مبلغ، گل کرسٹ کی دو شخصیتوں کے بیچ ایک سمجھوتے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۴؎

گل کرسٹ کی کوششوں سے پہلے فارسی اور عربی پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ مگر گل کرسٹ نے محسوس کیا کہ ہندوستانی سرزمین پر اردو یا ہندوستانی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور فارسی یا عربی، اردو کی جانکاری کے بعد اور آسانی سے سیکھی جا سکتی ہیں۔

انھیں بنیاد پر اس نے اردو سیکھنے کی جو کتابیں تیار کیں وہ دوسرے یورپی مصنفین سے بالکل الگ تھلگ تھیں اور اس طرح پہلی بار گل کرسٹ نے اردو کی تعلیم کے سلسلے میں جو کتابیں تیار کیں وہ قواعد اور علم اللسان کے اعتبار سے پہلے کی نسبت زیادہ سائنٹفک اور آسان تھیں۔

جہاں تک علم اللسان کا تعلق ہے گل کرسٹ کے سامنے وہ سارے کارنامے جو مختلف ہندوستانی عالموں نے قواعد و زبان کے سلسلے میں کیے تھے اور جن کا اعتراف گل کرسٹ نے خود کیا ہے۔ جو کچھ بھی مواد اس نے اکٹھا کیا وہ یورپی علماء سے اور اپنے خود کے تجربوں اور کوششوں سے حاصل کیا۔ مختلف علاقوں کا سفر کر کے گل کرسٹ نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی ایک ایسی زبان ہے جو تقریباً سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جس کی بنیاد پر اس نے لکھا: ۱۵؎

"---the peasant, the artist, the merchant, the priest, the soldier, the gentleman, the courtier, the prince and the king---whether

a follower of Qoran or Shastur, all speak and think, in this, their vernacular tongue".

گل کرسٹ زبان کو ہندوستانی کا نام دیتے وقت لکھتا ہے: ۱۶

"Before the irruption and subsequent settlement of Moosulmans the Hindooee or Hindi was to India, what the Hindoostanee is now to Hindoostan, varying more or less in its territorial excursion from the pure speech called by way of pre-eminence Brij Bhasha or the language of India. This ancient tongue, under various modifications is to Hindoostan, exactly what the Saxon was to England, before the Norman conquest."

دوسری جگہ لکھتا ہے: ۱۷

"Hindoos will naturally lean most to the Hindooee, while the Moosulmans will of course be more partial to Arabic and Persian; whence two styles arise, namely the court or high style and the country and the pristine style, Leaving the middle or familiar current style between them, which I have reco-

mmended as the best."

وہ ہندوستان میں تین اہم زبانوں کی بات کرتا ہے جن میں ہندوی، سنسکرت اور ہندوستانی آتی ہیں۔ ہندوی اور ہندوستانی کو زندہ زبان تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ سنسکرت کو ایک مردہ زبان قرار دیتا ہے اور کہتا ہے: ۱۸؎

"---(Sanskrit) really the dead letter of the civil and religious policy---."

ہندوی کی مختلف شکلوں کو مندرجہ خانوں میں تقسیم کرتا ہے: ۱۹؎

1.Bungalee

2.Rajpootee

3.Poorbee

4.Dukhanee

5.Ooreea

6.Mulwaree

7.Gujratee

8.Tilungee

9.Kishmeere

ہندوستانی کو وہ تین حصّوں میں تقسیم کرتا ہے:

1.The high, court, or Persian style

2.The middle or genuine Hindcostanee style

3.The vulgar or Hinduwee

پہلے حصّے میں وہ سودا اور میر درد کی شاعری کو رکھتا ہے جن میں عربی اور فارسی کی طرف زیادہ جھکاؤ ہے۔ دوسرے میں جسے وہ اصلی ہندوستانی کہتا

ہے، مسکین کا مرثیہ یا سودا کی ہجویات کو رکھتا ہے اور طرزِ تحریر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ لیکن وہ یہاں کوئی مثال نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ: ۲۰

"As the Language is still fluctuating and unsteady, it will be found difficult,if not possible, to avoid the extremes to which it is found certainly exposed in a coun_try especially, where pedantry, so far from being decried, is esteemed as touch-stone of learning; and where, on one hand the learned moosulman glories in his Arabic and Persian,and, on the other, the Hindoo is no less attached to his Sunskrik and Hinduwee."

الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں اس کا خیال ہے کہ مختلف علاقوں میں مختلف طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: ۲۱

"--- to a Bungalee ear, would shock a native of Dilhee, and other in harmonious unison with the articulation at Bunarus---."

گل کرسٹ نے ہمیشہ زبان کے مسئلے پر اسی زبان کو ترجیح دی اور وکالت کی جو سارے ملک میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ وہ تمام زبانوں کو سامنے رکھ کر ایک معیاری زبان Standard language کی بات کرتا ہے اور اس ضمن میں اس کے سامنے صرف ہندوستانی ہے۔

"He was unaware of the stage by stage dev_
elopment of the Indo-Arian Language which
he called Hinduwee before the coming of Mu-
slims. He knew nothing about Prakrit. Ab-
out the existence of .Dravidian Language. He
had never heard or read; and of Apa Bhransha,
he was equally ignorant.

یہی حال تالیف لغت کے سلسلے میں تھا۔ گل کرسٹ کی تالیف کردہ لغت
(سنہ ۱۷۸۶ء) اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ
کو اس سلسلے میں جو کام ہو چکا تھا، اس کا علم نہ تھا کیونکہ کہیں بھی نہ سراج الدین
علی خاں آرزو کی تصنیف کا ذکر ہے اور نہ ہی دوسرے علماء کا۔

حالانکہ گل کرسٹ نے تالیف لغت کے سلسلے میں منشیوں سے کافی مدد
لی جس کا اس نے اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کام
اس کی خود کی محنت کا نتیجہ ہے جس میں ایسے لوگوں کی ذرہ برابر مدد نہیں
لی گئی جو اس زبان کو ایک مدت سے استعمال کرتے رہے ہیں۔

حواشی و حوالے

۱ے عتیق صدیقی : گل کرسٹ اور اس کا عہد ــــــــ ص: ۳۷
انجمن ترقی اُردو (ہند)، اُردو گھر ، نئی دہلی ــــــ ۱۹۷۹ء

۲ے Asiatic Annual Register
(بحوالہ گل کرسٹ اور اس کا عہد۔ ص: ۴۱۔۴۰

۳ے ایضاً ص: ۲۹

۴ے ایضاً ص: ۳۳

۵ے S.R.Kidwai

Gilchrist and the language of Hindoostan

Page:2

(Rachna Prakashan, New Delhi-1972)

۶ے Akshoy Kumar Ghoshal:

Civil Services in India (under East India Company) Page: 244-45

University of Calcutta-1944.

۷ے The Welleslay Papers

ed.by: The editors of Windhan Papers

London-1914

۸ S.R.Kidwai:

Gilchrist and the Language of Hindoostan

(Page:17-18)

۹ Ibid (Page - 18)

۱۰ J.B.Gilchrist:

Appendix - Page: VII-VIII

۱۱ S.R.Kidwai:

Gilchrist and the Language of Hindoostan

Page-67

۱۲ J.B.Gilchrist:

Oriental Linguist - Page: V

Calcutta - 1798

۱۳ S.R.Kidwai:

Gilchrist and the Language of Hindoostan

Page:74

۱۴ Ibid Page:76

"---which was a compromise between Gilchrist the teacher and Gilchrist the preacher of "Hindoostanee". He expected

that those who depend very much on "the dornish medium of dialogue" would find enough incentive in the Oriental Linguist to take the help of a munshi and use other familiar exercise in study "because I conceive every other mode of consulting dialogue, productive of both indolence and ignorance, with the double deception of another's plausibly imposing upon their readers"---, but he still asserted that "---those scholars who Least with humdrum collection of ready made dialogue, will make the greatest real progress in Hindoostanee".

۱۵ J.B.Gilchrist:

Appendix - Page - XXI

۱۴ J.B.Gilchrist: ,

Page- IV

۱۶ J.B.Gilchrist:

Appendix

Page - XXII

۱۸ء Ibid

Page - XXII

۱۹ء Ibid

Page: XXII - XXIII

۲۰ء J.B.Gilchrist

Oriental Linguist

Page - 56

۲۱ء S.R.Kidwai:

Gilchrist and the Language of Hindoostan

Page: 93.

جی۔اے۔گریرسن

نویں جلد : حصّہ اوّل (صفحات ۸۰۶)
پہلی اشاعت : سنہ ۱۹۱۶ء
دوسری : سنہ ۱۹۶۸ء
اشاعت گھر : موتی لال۔ بنارسی داس
جواہر نگر ، دہلی

یہ کتاب جس میں ہندوستان کی تمام زبانوں اور بولیوں کے ارتقاد پر بحث اور تجزیہ کیا گیا ہے، گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں نویں جلد کے پہلے حصّے میں مغربی ہندی (ہندی اور اُردو) اور پنجابی سے متعلق بحث کی گئی ہے، گریرسن نے زبانوں اور بولیوں کے خاندانوں کی تقسیم کرتے ہوئے اسے ہند آریائی خاندان کا نام دیا ہے۔

زبان پر بحث شروع کرنے سے پہلے مصنّف نے الفاظ کے تلفظ کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے جس میں ہندی اور اُردو کے حروف کو انگریزی میں ادا کرنے کا طریقہ کار بھی بتایا ہے۔ مغربی ہندی کے جغرافیائی حدود کا

ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ زبان مدھیہ دیس Madhya Desa
میں بولی جاتی ہے جس کی حد بندی مغرب اور مشرق میں سرسوتی سے لے کر
آج کے الہ آباد تک کی جا سکتی ہے اور جنوب و شمال میں ہمالیہ سے نربدا
تک مزید وضاحت کی غرض سے مصنّف نے نقشہ بھی پیش کیا ہے۔

اس علاقے کو گریرسن ہندو تہذیب کا مرکز مانتا ہے۔ اس کے مطابق
مغربی ہندی، یو۔پی کے مغربی علاقے، پنجاب کے مشرقی ضلعوں میں، مشرقی
راجپوتانہ، گوالیار اور بندیل کھنڈ اور مدھیہ پردیش کے جنوب مغربی
علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

مزید براں اس کی ایک اہم بولی ہندوستانی، تقریباً سارے ہندوستان
میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ گریرسن مغربی کو پانچ بولیوں میں تقسیم
کرتا ہے؛

۱۔ ہندوستانی
۲۔ بانگرو
۳۔ برج بھاشا
۴۔ قنوجی اور
۵۔ بندیلی

ہندوستانی علاقائی زبان کی حیثیت سے مغربی روہیل کھنڈ، دوآبہ
اور انبالہ کے پنجاب ضلع میں بولی جاتی ہے۔ یہ مسلمان بادشاہوں کے
ذریعے سارے ہندوستان میں پھیلی۔ ادب اور تہذیب کے میدان میں
کافی اہمیت حاصل کی جسے تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛

۱۔ ادبی ہندوستانی؛ ادبی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں میں مقبول

ہے اور لنگوا فرنیکا کی حیثیت رکھتی ہے

۲۔ اُردو : خصوصاً اس کا استعمال مسلمانوں میں عام ہے اور ان ہندوؤں میں جنھوں نے مسلم تہذیب اختیار کر لی ہے۔

۳۔ ہندی : اس کا استعمال صرف ہندوؤں میں عام ہے اور ہندو مذہبی تعلیم تک محدود ہے۔

آگے وہ اُردو پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے بھی دو روپ ہیں :

۱۔ دہلی اور لکھنؤ کی معیاری ادبی زبان۔

۲۔ دکنی، جس کا استعمال دکن کے مسلمان ادبی طور پر کرتے ہیں۔

اس کے بعد بانگڑو، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی کی مختصر تعریف کرتا ہے۔

زبان کے ارتقاء اور جغرافیائی علاقائیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس کا سیدھا رشتہ اپھرنش اور شورسینی سے ملتا ہے۔ یہ ان علاقوں میں بولی جاتی ہے جو آریاؤں کی تہذیب کا مرکز رہے ہیں۔

مغربی ہندی کی لسانی حد بندی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے جنوب مغرب میں پنجابی شمال مغرب اور شمال میں راجستھانی، شمال مشرق میں مراٹھی اور مشرق میں مشرقی ہندی، جنوب میں ہند آریائی بولیاں جون ساری، گڈھوالی اور کماؤنی ہیں۔

رسم خط کا ذکر کرتے ہوئے وہ مغربی ہندی لکھنے کے دو طریقے بتاتا ہے۔ ہندوستانی کے لیے فارسی رسم خط اور دوسری بولی کے لیے دیوناگری زبان کے قواعد کے سلسلے میں اس کا خیال ہے کہ مغربی ہندی کی تمام

بولیوں کے لیے ہندوستانی کی قواعد ہی معیاری مانی جاتی ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ ہندوستانی کا استعمال سب سے پہلے ۱۶۱۶ء میں ٹیری نے کیا جب وہ ٹام کوریٹ Tom Coryate کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے ہندوستانی پر عبور حاصل ہے۔ یول Yule فرائرد (۱۶۷۳ء) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ درباری زبان فارسی ہے اور عام طور پر استعمال کی جانے والی زبان ہندوستانی Indostan ہے جس کا کوئی باقاعدہ رسم خط نہیں ہے۔ لکھی جانے والی زبان کو بنیان Banyan کہتے ہیں۔

مغربی ہندی کی تعریف کے بعد اس نے ایک بہت ہی طویل فہرست کتابیات کی دی ہے اور ہندوستانی کے ارتقاء پر تفصیلی بحث کی ہے اس کا کہنا ہے کہ مغربی ہندی کی بولی کی حیثیت سے اس کے کئی نمونے ہیں جنھیں موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ؛

۱۔ عام ہندوستانی

۲۔ ادبی ہندوستانی

عام ہندوستانی اوپری دوآبہ اور مغربی روہیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور ادبی ہندوستانی تقریباً تمام ہندوستان کی ایک شائستہ زبان ہے جو خصوصاً شمالی ہند کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان ہے۔ ادبی ہندوستانی اتنی مقبول اور اہم ہے کہ اسے مغربی ہندی کی معیاری بولی کہہ سکتے ہیں۔

گریرسن ادبی ہندوستانی میں اردو اور ہندی دونوں کو شامل کرتا ہے۔ اس کے تلفظ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ لفظ ہندوستانی

Hindostani ہے نہ کہ ہندستانی Hindustani ۔ لفظ ہندوستان Hindustan فارسی سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہندوؤں کا ملک ہے۔ ہندوستانی لفظ یورپی اثرات کے تحت وجود میں آیا جس کے معنی ہندوستان کی زبان کے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ٹیری Terry اور فرائر Fryer جیسے لوگوں نے اُس وقت بولی جانے والی زبان کو Indostan لکھا ہے اور قدیم برطانوی مصنّفین نے اسے مورس Moors اور شاید گل کرسٹ پہلا شخص ہے جس نے ۸۷-۱۷۸۶ء میں لفظ "ہندوستانی" کا استعمال کیا۔

ادبی ہندوستانی کی اعتبار سے ہندوستان کے مہذب لوگوں کی زبان ہے جو تقریباً سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ادب میں نظم و نثر دونوں کی زبان ہے۔ اس کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ اُس زبان کو بولنے والے کتنے ہیں ۔ علاوہ ازیں اس کا استعمال مختلف شکلوں میں ہوتا ہے کیونکہ تھوڑی دوری پر بولیوں میں فرق آجاتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے شہروں میں ہندوستانی کا اردو طریقہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں عام ہے۔ لیکن اس کا استعمال کرنے والوں کی تعداد بتانا مشکل ہے۔ صرف ہندوستانی کی دکنی شکل کی تعداد پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد گریرسن نے درج ذیل جدول Table کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد کیا ہے:

WESTERN HINDI.

Table showing the estimated number of speakers of Literary Hindōstānī in the various Provinces of India.

Province.		Estimated number of speakers.
Assam		32,290
Bengal		1,828,372
Berar		4,000
Bombay—		
Gujarat	101,191	
Sindh	18,009	
		119,200
Burma		83,694
Central Provinces		80,256
Panjab		1,329,801
United Provinces		3,859,291
Baroda		11,026
Mysore		25,534
Rajputana, Central India, and Ajmere-Merwara		322,000
Kashmir		800
Add figures for Dakhini		3,654,172
TOTAL		11,350,436

Origin of the dialect.

As already stated, Literary Hindōstānī is based on the vernacular Hindōstānī spoken in the Upper Doab and in Western Rohilkhand. It grew up as a *lingua franca* in the polyglot bazaar attached to the Delhi court, and was carried everywhere in India by the lieutenants of the Mughul Empire. Since then its seat has been secure. It has been adopted as the language which every follower of Islām (the religion of the Emperors) speaks if he can, and its simple grammar and enormous vocabulary have rendered it able to fill the need which has always been felt in such a polyglot tract as India for a *lingua franca*. It has also received, in at least two of its forms, considerable literary cultivation.[1]

زبان کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ہندوستانی لنگوا فرینکا کی حیثیت سے پھولی جس کا رشتہ دہلی کے دربار سے جوڑا جا سکتا ہے اور جہاں کھچڑی زبان استعمال میں آتی تھی۔ یہ زبان مغل فوجیوں کے ذریعے لے جائی گئی اور تب سے اس نے سارے ملک میں اپنی دھاک جمالی۔ یہ زبان ان تمام لوگوں نے قبول کی جو اسلام کے پیرو تھے (جو حکمرانوں کا مذہب تھا) اس کی آسان قواعد اور غیر معمولی ذخیرۂ الفاظ ترسیل کی تمام ضروریات کو پورا کرتے تھے۔

گریرسن ادبی ہندوستانی کو کئی حصّوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں اُردو، ریختہ، دکنی اور ہندی کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہے۔ اُردو کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ اُردو ہندوستانی کی ایک ایسی شکل (فارم) ہے جس کا رسم خط فارسی ہے اور جس کے ذخیرۂ الفاظ میں آزادی سے فارسی کا استعمال (اور عربی کا بھی) ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لفظ اُردو 'اُردوئے معلیٰ' یا شاہی فوجی بازار سے ماخوذ ہے۔ بنیادی طور پر یہ مغربی ہندوستان کے ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے حلقوں میں بولی جاتی ہے جو فارسی تہذیب سے زیادہ متاثر ہیں۔ حالانکہ فارسی کے الفاظ ہندوستانی کی تمام بولیوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ فارسی الفاظ پر پابندی لگانا ویسے ہی مشکل ہے جیسے لاطینی الفاظ جو انگریزی میں رچ بس گئے ہیں، ان پر پابندی لگانا۔ لیکن جہاں تک معیاری اُردو کا تعلق ہے، فارسی الفاظ کا استعمال شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر ایسی تحریروں میں شروع سے لے کر آخر تک فارسی الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ صرف قواعد سے پتہ لگتا ہے کہ یہ زبان اُردو ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ زبان کو شدید

فارسی زدہ کرنا ان حکمرانوں کا کام نہیں جو عوام کی زبان سے ناواقف تھے۔ دوسری طرف اردو کی ترقی میں ان کایستھوں اور کھتریوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے اپنے حکمرانوں کی زبان میں لکھنے کی کوشش کی۔ یہ ایسے لوگ تھے جو حکومت کے نظم و نسق سے تعلق رکھتے تھے اور جو فارسی داں تھے۔ ان کی حیثیت اُن ایرانیوں یا ترکوں کی نہ تھی جو کئی صدیوں تک صرف اپنی زبان کا استعمال کرتے رہے اور عوام سے کٹے رہے۔ سر چارلس لائل Sir Charles Lyall کے مطابق اس طرح اب فارسی ہندوستان کی غیر ملکی زبان نہیں رہ گئی تھی لیکن خالص فارسی کا استعمال (جیسا کہ بہتوں نے کیا) اور عوام سے رشتہ ختم کرنا سیاسی ناسمجھی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ گریرسن نے بھی چارلس کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار اگر کوئی لفظ ہندوستانی میں داخل ہو گیا تو کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، اس کی چاہے جو بھی ساخت ہو۔ اختلاف رائے وہاں ہو سکتا ہے کہ کن الفاظ کو زبان نے قبول کر لیا ہے اور کن الفاظ کو جگہ نہیں ملی۔ اور یہ صرف اسلوب کا فرق ہے، ویسے ہی جیسے انگریزی میں مختلف اسلوب ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں لوگوں کی اپنی پسند اور ناپسندیدگی کو بھی دخل ہے۔

ریختہ کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہ ایسی زبان ہے جو بکھری ہوئی یا ٹکڑے ٹکڑے ہو اور یہ ایسی شکل form ہے جو اردو شاعری میں ملتی ہے۔ اس میں مقامی بولیوں کے علاوہ فارسی کے بکھرے ہوئے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ جب عورتیں اپنی مخصوص بولی میں شاعری کرتی ہیں تو اسے ریختی کہتے ہیں اور اس کا الگ اپنا ذخیرۂ الفاظ ہے۔

دکنی کو ہندوستانی کی ایسی شکل کہا جا سکتا ہے جسے دکن کے مسلمان استعمال کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اردو کی طرح یہ بھی فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے لیکن فارسی زدگی Persianisation سے بہت آزاد ہے۔ اس کی قواعد (جیسے "مجھکو" کے بجائے "میرے کو") جنوبی ہند کے دیہاتی علاقوں (جو ادبی بولیوں میں نہیں ملتی) جیسی ہے۔

اس کے بعد مصنف کی ہندی کی تعریف تفصیل سے کی ہے۔ اور آگے چل کر ہندی اور اردو کے فرق کو اور بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی کو ہندی اور اردو سے الگ کر کے دیکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستانی ایسی زبان ہے جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے۔ اور جس میں فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا کثرت سے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح اردو ہندوستانی کی اس خاص قسم تک محدود ہو جاتی ہے جو صرف فارسی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے اور جس میں فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے گئے ہوں۔ اسی طرح ہندی کو ایک ایسی زبان کہہ سکتے ہیں جو صرف دیوناگری رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے اور جس میں سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہو۔

ادبی زبان کی حیثیت سے ہندوستانی کے ابتدائی نمونے اردو میں یا بنیادی طور پر ریختہ میں ملتے ہیں۔ زیادہ تر تخلیقات منظوم ہیں۔ دکن میں اس کی ابتدا سولہویں صدی سے ہوئی اور سو سال میں اس نے ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ خصوصاً ولی اورنگ آبادی کا بہت بڑا مقام ہے جنھیں "بابائے ریختہ" کہا جاتا ہے۔ ولی کی روایت بہت جلد دہلی پہنچی جہاں شاعری کا ایک اسکول وجود میں آچکا تھا جس کے

رہنماؤں میں سودا اور میر جیسے لوگ شامل تھے۔ اس پائے کا ایک اور اسکول لکھنؤ میں اٹھارویں صدی میں وجود میں آیا۔ اردو اور دوسری بولیوں کی شاعری میں سب سے بڑا فرق عروض کا تھا۔ اردو کی شاعری کی بنیاد فارسی علم عروض پر تھی تو دوسری بولیوں میں خالص ہندوستانی پن کی جھلک ملتی ہے ___ اردو نثر کی ادبی ابتدا انیسویں صدی میں کلکتے سے ہوئی۔ ہندی کی طرح یہ بھی انگریزی اثرات کی وجہ سے اور فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی کے دونوں روپ میں درسی کتابوں کی ضرورت کی وجہ سے ہوئی ___ میر امن کی "باغ و بہار"، حفیظ الدین احمد کی "خرد افروز" اُردو نثر کے ابتدائی نمونے ہیں اور للو لال کی "پریم ساگر" کو ہندی نثر کے ضمن میں رکھی جا سکتی ہے۔

گریرسن کے مطابق اُردو اور ہندی جو ہندوستان کے دو اہم مذاہب کی نمائندگی کرتی ہیں، ان کا علاقہ بہت ہی وسیع ہے۔ ادبی اعتبار سے دو باہم مخالف شہر دہلی اور لکھنؤ خود کو اردو کے صدر مقام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ گو کہ دونوں کے اسالیب میں نمایاں فرق ہے۔ لکھنؤ کی اُردو دہلی کے مقابلے میں زیادہ فارسی آمیز ہے۔ وہ دہلی کی اردو میں زیادہ ہندوستانیت محسوس کرتا ہے۔ یہاں کے فن کار مقامی الفاظ کے استعمال سے ہچکچاتے نہیں جبکہ لکھنؤ کے لوگ فارسی الفاظ کے کثرت استعمال کو بھی کمالِ فن سمجھتے ہیں۔ اردو کی طرح ہندی کے بھی دو ادبی اسکول ہیں۔ بنارس اسکول اور آگرہ اسکول، بنارس اسکول کے ادیبوں کا رویّہ اردو کے لکھنؤ اسکول جیسا ہے جو ہندی میں سنسکرت الفاظ کے کثرت استعمال پر زیادہ زور دیتے ہیں جبکہ آگرے کے ادبا کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔

ہندی کے رسم خط کا دوبارہ ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک مذہبی مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلمان عام طور سے کچھ حروف کے اضافوں کے ساتھ فارسی رسم خط کا استعمال کرتے ہیں اور ہندو دیوناگری یا کیتھی رسم خط کا استعمال کرتے ہیں۔ آسان ہندوستانی جو نہ فارسی زدہ ہے اور نہ ہی سنسکرت زدہ عموماً دونوں میں لکھی جاتی ہے۔ عام طور پر اس طرح کی کتابیں زیادہ مقبول ہوتی ہیں جو دونوں رسم خط میں چھپی ہوں۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں کایستھ دونوں رسم خط سے واقف ہیں۔

جب ہندوستانی کو اردو کے نام پر زیادہ فارسی زدہ کر دیا جاتا ہے تو الفاظ اتنے زیادہ غیر ملکی لگتے ہیں کہ انھیں دیوناگری رسم خط میں لکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اردو ہمیشہ فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور یہی حال ہندی کے ساتھ ہے جو دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ کچھ متعصب لوگوں نے اسے مذہبی رُخ دے دیا ہے۔ چونکہ ہندوستانی کی یہ دو شکلیں، جو الگ الگ رسم خط میں لکھی جاتی ہیں، لسانی تعصب کا شکار ہو گئیں اور ان متعصب لوگوں نے حروف کو زبان کے ساتھ گڈمڈ کر دیا۔ ان لوگوں کے مطابق جو تحریر دیوناگری میں لکھی گئی ہے وہ لازمی طور پر ہندی ہو گی جو ہندوؤں کی زبان ہے اور اگر وہی چیز فارسی رسم خط میں لکھی ہے تو وہ اردو ہو گی جو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان دونوں مفروضوں کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہیں کیونکہ رسم خط زبان نہیں بناتا اور اگر ایسا ہے تو جب ہم ہندوستانی کو رومن رسم خط میں لکھتے ہیں تو اسے انگریزی سمجھنا چاہیئے نہ کہ ہندوستانی۔ یہ متعصب لوگ ان دلیلوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دراصل حروف تہجی کے سلسلے میں حکومت ہند کی پالیسی کو غلط طریقے سے سمجھا گیا۔ جب اس طرح کا

اعلان ہوا کہ کچھ جگہوں پر سرکاری طور پر دیوناگری کا استعمال کیا جا سکتا ہے تو بہت ہنگامہ ہوا جس نے بہت سے سمجھدار مسلمانوں کو گمراہ کر دیا کہ اب ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر لادا جا رہا ہے۔ اس معاملے میں حکومت جانتی تھی کہ سنسکرت زدہ اور فارسی زدہ اردو عوام کی سمجھ سے باہر ہو گی اس لیے کسی کو کوئی سرکاری حیثیت نہیں دی گئی۔ اسی حکومت نے یہ تاکید کی ہے کہ سرکاری کاغذات بغیر زبان تبدیل کیے اس طرح لکھے جائیں جو ان لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائے جو پڑھنے والے ہیں۔

ہندوستانی کی قواعد پر بحث کرتے وہ کہتا ہے کہ تمام ہند آریائی بولیوں کی طرح یہ بھی قدیم ہندوستانی بولیوں سے وجود میں آئی ہے۔ ان قدیم بولیوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جس کی مثالیں دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار عیسوی تک ملتی ہے ——— جہاں تک صرف و نحو کا تعلق ہے کبھی کبھی اردو میں فارسی ترکیبوں میں اضافتیں مستعار ہوتی ہیں لیکن یہ صرف کسی خاص سیاق و سباق یا مخصوص اسلوب کی حد تک ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کے فرق کے علاوہ ہندوستانی کی ان دو قسموں میں محاروں کا بھی فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہندی میں الفاظ کی ترتیب تبھی مقرر کی جا سکتی اور بدلی جا سکتی ہے جہاں کسی خاص چیز پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ اردو میں فارسی کی قربت نے بہت سے قوانین آسان بنا دیئے ہیں۔

وہ ہندوستانی کے خزانۂ الفاظ کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

۱۔ خالص ہندوستانی الفاظ۔

۲۔ سنسکرت سے مستعار الفاظ۔

۳۔ فارسی سے (عربی سمیت) مستعار الفاظ اور
۴۔ دوسرے ذرائع سے مستعار لیے گئے الفاظ۔

جہاں تک فارسی اور عربی الفاظ کا تعلق ہے مسلمانوں سے قبل کی قدیم فارسی کے الفاظ نہیں بلکہ عربی سے متاثر مغل حکمرانوں کی فارسی سے زیادہ قریب ہیں۔ اس طرح ہند آریائی زبانوں نے فارسی کے علاوہ عربی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور کچھ حد تک ترکی الفاظ بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلام نے عربی کے لیے دروازے کھول دیئے اور عرب تاجروں کے ذریعے بھی کچھ الفاظ ہندوستانی میں شامل ہوئے۔ گریرسن کے مطابق تمام ہندوستانی زبانوں میں عربی کے جو بھی الفاظ آئے ہیں وہ زیادہ فارسی کے ذریعے آئے ہیں۔

سنسکرت الفاظ کی دو شکلیں ہیں ایک وہ جو سیدھے سنسکرت لغت سے اسی شکل میں لیے گئے ہیں۔ ایسے الفاظ کو تت سم اور وہ الفاظ جن کی شکل بدل دی گئی ہے انھیں تدبھو کہتے ہیں۔ خالص ہندوستانی میں ایسے الفاظ زیادہ ہیں جن کی شکل تدبھو ہے اور یہی زبان کی بنیاد ہیں۔

گریرسن "دکنی" کو "مسلمانی" بھی کہتا ہے۔ زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مسلمان افواج نے دکن میں اپنے ہم مذہب لوگوں میں اپنی زبان شروع سے ہی عام کی ۔ دکن میں چاہے علاقائی زبان مراٹھی، تامل، تلگو یا کوئی دراوڑی زبان رہی ہو، مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان کی دکنی شکل پر زیادہ زور دیا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ دکن ہی میں ہندوستانی کی اردو شکل نے ولی اورنگ آبادی کے یہاں ایک ادبی حیثیت پائی۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ دکنی ہندوستان کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ لیکن

تاریخی اعتبار سے ادبی ہندوستانی دکنی کا ایک بگڑا ہوا روپ ہے کیوں کہ ہندوستانی ادب نے دکن میں ہی جنم لیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان حکمراں ہندوستانی کو اس وقت شمال دکن کی طرف لے گئے جب اس نے کوئی معیار حاصل نہیں کیا تھا اور ایسے بہت سے الفاظ اور محاورے تھے جو بعد میں متروک قرار دیئے گئے۔

۱۸۹۱ء کی رائے شماری کی بنیاد پر دکنی بولنے والوں کی تعداد مندرجہ ذیل چارٹ کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔

DAKHINĪ HINDŌSTĀNĪ OR MUSALMĀNĪ.

Table showing the approximate number of speakers of Dakhinī Hindōstānī

Berar		274,192
Bombay—		
Bombay City	94,431	
Thana	24,821	
Kolaba	5,932	
Ratnagiri	25,867	
Kanara	18,627	
Khandesh	117,844	
Nasik	47,977	
Ahmednagar	48,847	
Poona	57,669	
Sholapur	56,669	
Satara	40,781	
Belgaum	76,950	
Dharwar	101,216	
Bijapur	79,999	
Feudatories	254,282 [1]	
		1,051,912
Central Provinces—		
Nagpur	41,616	
Wardha	14,836	
Chanda	10,939	
Bhandara	11,685	
		79,076
Madras—		
British Territory	817,146	
Native States	17,707	
		834,853
Nizam's Dominions		1,198,382
Mysore		208,928
Coorg		6,919
	TOTAL	3,654,172

The Authorities which deal with Dakhinī are included in the General Bibliography of Western Hindī. I here give a brief account of the main points in which the dialect differs from standard Hindōstānī.

Authorities, Grammar.

DECLENSION.

Nouns.—The oblique form singular is formed as in standard Urdū. The nominative and oblique plural are often formed differently. The common rule is that the nominative plural usually ends in *ē* or *ā̃*, and the oblique plural in *ō̃* or *y* .. Sometimes *ā̃* is used for the nominative plural, and *ā̃* for the oblique plural.

The following are examples:—

Nom. Sing.	Obl. Sing.	Nom. Plur.	Obl. Plur.
piyāla, a cup	*piyālē*	*piyālē*	*piyālō̃*
andēsha, thought	*andēshē*	*andēshē*	*andēshyaũ*
ghōrā, a horse	*ghōrē*	*ghōrē*	*ghōrō̃*
kauwā, a crow	*kauwē*	*kauwē*	*kauwyaũ*
baniyā̃, a trader	*baniyē*	*baniyē*	*baniyō̃*
āshnā, an acquaintance	*āshnā*	*āshnāō̃*	*āshnāō̃*
dānā, a sage	*dānā*	*dānāyā̃*	*dānāyō̃*

¹ Many of these speak the standard form of Hindōstānī, but it is impossible to separate them out.

آگے کے صفحات میں اس نے بڑی تفصیل سے قواعد اور صرف و نحو پر
بحث کی ہے۔ اس نے ہندوستانی کی کئی قسمیں بتائی ہیں جن میں ایک

مقامی ہندوستانی Varnacular Hindustani کا
بھی ہے۔ اسے وہ مغربی ہندی کی ایک بولی قرار دیتا ہے جو مغربی روہیل کھنڈ،
دوآبہ اور انبالہ کے پنجاب ضلع میں بولی جاتی ہے۔ مقامی ہندوستانی سے
ہندوستانی کی ایسی شکل مراد ہے جس پر دہلی میں عروج پانے والی ادبی
ہندوستانی مبنی ہے۔

اس کے بعد گریرسن نے بانگڑو، جاتو، ہریانوی اور برج بھاشا پر تفصیلی
بحث کی ہے۔ ساتھ ہی قنوجی اور بندیلی پر بھی بحث کی ہے اور ان تمام
بولیوں کی قواعد، علاقوں اور ذخیرۂ الفاظ کا باقاعدہ جائزہ لیا ہے۔ اس
کے علاوہ پچھلے صفحات پر ہندوستانی پر بحث کے سلسلے میں اس نے زبان
کے تحریری نمونے پیش کئے ہیں۔ پہلی مثال ٹھیٹھ ہندوستانی کی ہے جس میں
مصنف نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ کس طرح اسے دونوں طریقوں (فارسی اور
دیوناگری) سے لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ ٹھیٹھ ہندوستانی ہی کے ضمن میں
اس نے لکھا ہے کہ اس میں کچھ الفاظ غیر ملکی زبانوں کے ہونے کے باوجود
اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ اسی زبان کے ہو گئے ہیں اور ایسا نہیں لگتا کہ باہر
کے اور بھرتی کے الفاظ ہیں۔ اس ضمن میں اس نے مہامہو پادھیائے پنڈت
سدھاکر دویدی، انشاء اللہ خاں انشاء اور پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے
کی تخلیقات کے نثری نمونے پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی لکھنؤ کی معیاری اردو،
لکھنؤ کی قصباتی اردو، لکھنؤ کی بیگماتی اردو، اور دہلی کی معیاری اردو کے
نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد رومن رسم خط میں معیاری اردو کے
نمونے دہلی کی جدید اردو کے نمونے اور پھر مجموعی طور پر اردو شاعری پر
بحث کی گئی ہے۔

جہاں تک اردو کی کلاسیکی شاعری کا تعلق ہے، گریرسن سب سے پہلے میر کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے سراج الدین خاں آرزو کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ شیکسپیئر کی مرتب کردہ "منتخبات ہندی" سے میر کی شاعری کے نمونے مع ترجمہ کے پیش کیے گئے ہیں۔ جدید اردو شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے وہ حالی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "حالی کو نثر و نظم دونوں میدانوں میں عظمت حاصل ہے۔ اسی ضمن میں نذیر احمد کا بھی ذکر کرتا ہے۔

دکنی کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اس نے اس کے بھی نمونے پیش کیے ہیں۔ مثلاً بمبئی کی دکنی اور مدراس کی دکنی۔ ان نمونوں کو پہلے کی طرح ترجمہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

گراھم بیلی

گراہم بیلی کی یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں مکمل ہوئی اور ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ لندن سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں سُمیت پبلکیشنز سے چھپا۔ یہ کتاب ایک سو بیس (۱۲۰) صفحات پر مشتمل ہے جسے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

زبان کی تاریخ اور تعریف سے پہلے مصنّف نے دیباچے میں یہ بات صاف کردی ہے کہ تاریخ لکھتے وقت اس نے تذکروں کو بنیاد بنایا ہے اور دیگر دشواریوں جیسے مختلف مخطوطات کا نہ ملنا اور اصل متن کے تعین کی دقتوں وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

تاریخ ادب کا آغاز کرنے سے پہلے اس نے اردو شاعری کی مختلف اصناف کی تعریف بھی کی ہے کیونکہ اس کا قاری اردو داں طبقہ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

زبان کی ابتدا اور ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے پہلے اس نے مختصر الفاظ میں اردو زبان کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا کیمپ کے ہیں۔ اس قول کو وہ مثالوں کے ذریعہ ثابت کرتا ہے۔ وہ اردو کا رشتہ ۱۱۹۳ء اور اس کے بعد دہلی میں مقیم

مسلمانوں کی فوج سے جوڑتا ہے کیونکہ اسے بھی اردو یا اردوئے معلیٰ کہا جاتا تھا۔ وہ یہ نہیں مانتا کہ فوج کی زبان فارسی تھی اور عوام برج بھاشا بولتے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ دہلی کے لوگ کھڑی بولی بولتے تھے جو ہندی کی ابتدائی شکل ہے۔ یہاں وہ اپنے اس خیال کی تشریح نہیں کرتا۔

اس کے خیال میں ۱۰۲۷ء میں محمود غزنوی کا پنجاب میں داخل ہونا اردو زبان کی ابتدا کے سلسلے میں اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔ (حالانکہ محمود غزنوی کا سترہواں حملہ سومنات ۱۰۲۴ء میں ہوا۔ اس سے پہلے بھی پنجاب میں فارسی بولنے والے الپتگین اور سبکتگین بادشاہ رہ چکے تھے) وہ کہتا ہے کہ اس وقت البرونی (۹۷۳ــ ۱۰۴۸ء) یہیں مقیم تھا اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرکے ہندو مذہب سے متعلق تحقیقات میں مصروف تھا۔

۱۱۸۷ء میں محمد غوری کا حملہ ہوا اور ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک دہلی پر قابض ہوا جو ترک تھا اور جس نے ۱۲۰۶ء میں سلطان ہونے کا اعلان کیا۔ (یہ تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ محمد غوری کا پہلا حملہ ۱۱۹۲ء میں اور دوسرا ۱۱۹۳ء میں ہوا۔ جنگ ترائن مشہور لڑائی ہوئی۔)

ان حقائق کی روشنی میں بیلی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی ابتدا ۱۰۲۷ء سے ہوئی جب پنجاب میں مقیم وہ فوجی جو باہر سے آئے تھے اور علاقائی اثرات قبول کرتے ہوئے پنجابی اردو بولنے لگے تھے۔

اس طرح بیلی کے خیال سے اردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔ اس نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس کا ماخذ، بنیاد یا دلائل پیش نہیں کیے۔ صرف مندرجہ بالا حقائق سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کیا۔

پنجاب میں اردو زبان کی بنیاد قائم کرنے کے بعد اور قطب الدین ایبک

کی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس وقت سے شہر کے چاروں طرف غیر ملکی افواج تعینات ہونا شروع ہوئیں جن کی زبان ظاہر ہے ہندوستان کی نہ تھی۔ اس کا یہ خیال ہے کہ اردو دہلی میں پھولی پھلی لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ فارسی گو فوجی لوگ پنجاب میں داخل ہونا شروع ہوئے اور انھوں نے یہیں رہنا شروع کیا۔ یہ بات دہلی پر پہلی سلطنت قائم ہونے کے دو سو سال پہلے کی ہے اور اس طرح جو کچھ بھی دہلی میں ہوا صدیوں پہلے اس کی بنیاد لاہور میں پڑ چکی تھی۔ بلاشبہ ان لوگوں نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ شادیاں بھی کی ہوں گی اور کچھ عرصے بعد یہاں کی زبان بولنا سیکھ گئے ہوں گے اور زبان پر فارسی زبان کی چھاپ بھی پڑی ہوگی۔ وہ کہتا ہے کہ ہم سوچ سکتے ہیں کہ ان حالات میں کیا ہوا ہوگا۔ ظاہر ہے فوجی لوگ اور عام باشندے روز ملتے رہے ہوں گے اور اس کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ یہ زبان یا تو فارسی ہو سکتی تھی یا قدیم پنجابی۔ چونکہ پنجابی بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لیے دھیرے دھیرے فارسی کا زوال شروع ہوا اور یہ صرف دربار و دفاتر تک محدود ہو کر رہ گئی۔

دہلی اور لاہور میں وہی ہو رہا تھا جو انگلستان میں نارمن کی فتح کے بعد شروع ہوا۔ نارمن جو فرانسیسی کی ایک بولی بولتے تھے انھوں نے ایک اینگلو سیکسن ملک میں فرانسیسی کو دربار کی زبان بنایا حالانکہ انھوں نے مفتوحہ ملک کے گہرے اثرات قبول کیے۔ اور تین صدیوں کے بعد آج وہاں (انگلستان) کی زبان انگریزی ہے۔ بیلی کا خیال ہے کہ ایسا ہی اردو زبان کے ساتھ ہوا لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے وہ ٹھوس ثبوت نہیں لاتا۔

دہلی پر قطب الدین کی حکومت قائم ہونے کے بعد بیلی کا خیال ہے کہ یہاں کے لوگوں نے کوئی ایسی زبان بولنی شروع کی ہوگی جو اردو سے بہت نزدیک ہوسکتی ہے اور اس کی بنیاد پنجابی ہے جس نے پراکرت سے جنم لیا اور جو کھڑی بولی سے اس قدر مختلف نہیں ہوسکتی جتنا فرق آج نظر آتا ہے۔ بیلی کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ اردو نے دہلی میں نہیں بلکہ لاہور میں جنم لیا جہاں کھڑی بولی نہیں بلکہ قدیم پنجابی تھی۔

بیلی نے ادب کے ادوار کی تقسیم تاریخ اور علاقے کی بنیاد پر کی علاوہ اس کے وہ مذہبی پہلو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ تیسرے تاریخی سطح پر پہلے دور کا پہلا حصہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے زمانے پر محیط ہے۔ بیلی کے خیال کے مطابق اس عہد کے ادیبوں پر مذہب کی گہری چھاپ ہے۔ وہ اس ضمن میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شیخ عین الدین گنج العلوم، عبد اللہ حسینی، شاہ میراں جی اور شاہ برہان وغیرہ کی تخلیقات کا ذکر کرتا ہے۔

دوسرے حصے میں ۱۷۳۰ تا ۱۵۹۰ء کی تصنیفات مذکور ہیں اور اس حصے میں صرف دکن کے ادبی کارناموں سے بحث کی گئی ہے۔ اس دور کو اس نے قطب شاہی دور کہا ہے اور جو قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، رستمی، نصرتی، ولی اور سراج پر مشتمل ہے۔ ان تمام شعراء کے مختلف حالات زندگی اور کلام کے ادبی نمونے بھی پیش کیے ہیں مگر ان ادبی نمونوں کے ماخذ اور اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔

دوسرے ادبی دور کو دہلی میں اردو شاعری کی پہلی صدی کا نام دیا گیا ہے اور ۱۷۳۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:-

الف: حاتم کا دور جس میں صوفی شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔
ب: مظہر، سودا، میر اور درد کا دور۔
ج: مصحفی، انشاء اور نظیر کا دور۔

الف:

حاتم کا دور کا ذکر کرتے ہوئے وہ دو اہم شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ہیں افضل اور جعفر زٹلی۔ ان کے علاوہ جن دوسرے شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں احمد، آبرو، یک رنگ اور حاتم اہم ہیں۔ اس نے صرف جعفر زٹلی اور احمد کے ادبی نمونے پیش کیے ہیں۔ باقی لوگوں کے ادبی نمونے پیش نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی اور جن لوگوں کی نظمیں ترجمہ کر کے پیش کی ہیں ان کے ماخذ اور سبب کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔

ب:

اس حصے کو اس نے "اردو کے چار ستون کا دور" کا نام دیا ہے جن میں مظہر، سودا، میر اور درد کو شامل کیا ہے۔ اس نے ان شعراء کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں لیکن ان کے ادبی نمونے پیش نہیں کیے۔

ج:

اس حصے میں بھی اس نے مصحفی، انشا، حسرت، جرأت، رنگین، یقین، اثر، ہدایت، قدرت، ضیا، نظیر اور ناصر وغیرہ کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔ نہ ہی ان ماخذ کی طرف اشارہ کیا ہے اور نہ ہی ان شعراء کا کوئی انتخاب پیش کیا ہے۔

چوتھے باب میں بیلی نے لکھنؤ میں انیسویں صدی کی اردو شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں اس نے بہت ہی مختصر تاریخی حالات کا ذکر

کرتے ہوئے مختلف شعرا کے حالات زندگی پیش کیے ہیں اور اس دور کی مخصوص صنف اس نے مرثیے کو قرار دی ہے اور انیس و دبیر کے مرثیوں کو بنیاد بنایا ہے۔ لیکن اس نے مراثی کا کوئی انتخاب نہیں پیش کیا۔ اس دور کے اہم شعرا میں خالق، ضمیر، شاہدی، نسیم، ناسخ، آتش، رند، رشک، برق، مہر، بحر، خلیل، آباد، اختر، اسیر، قلب، ذکی، درخشاں، امانت، مونس، شوق، عشق، نفیس اور عارف وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام شعرا کے بارے میں مختصر نوٹ دیئے گئے ہیں جن کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا۔

پانچویں باب میں دہلی میں اردو شاعری کا دوسرا دور اور رامپور کے چار شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں ذوق، غالب، بہادر شاہ ظفر، اصغر علی خاں نسیم، تسکین، شیفتہ، آزردہ، سالک، ضیا، ثاقب، ذکی، ظہیر الدین ظہیر، مرزا انور اور میر مہدی مجروح پر نوٹ لکھے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں داغ اور ضامن علی جلال، امیر مینائی اور تسلیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں بھی شعرا کے کلام کے نمونے پیش نہیں کیے۔ صرف چند شعری خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں اردو نثر پر بحث کی گئی ہے اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ اردو کے ابتدائی نثر نگاروں سے متعلق ہے جس میں جعفر زٹلی کی نثر کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ زٹلی کی نثر میں روانی ہے اور آسان فطری زبان کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کے بعد فضلی کی تصنیفات اور محمد حسین کلیم، سودا، محمد عطا حسین تحسین وغیرہ کی تصانیف کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے۔

دوسرے حصے میں فورٹ ولیم کالج کے ان کارناموں کا ذکر ہے جو ترجمہ

کی شکل میں سامنے آئے۔ اس حصّے میں گل کرسٹ کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے مرزا علی لطف، سید حیدر علی بخش حیدری، میر امّن، بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس، حفیظ الدین احمد، نہال چند لاہوری، للّو لال، کاظم علی جوان، مظہر علی ولا، اکرام علی، امانت اللہ شیدا اور بینی نرائن وغیرہ کے حالات و تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرے حصّے میں انیسویں صدی کے اردو نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں مولوی اسماعیل شاہ رفیع الدین، خلیل اللہ خاں اشک، مرزا جان طپش، انشا اللہ خان انشا، رنگین، گویا، رجب علی بیگ سرور، غالب، غلام امام شہید، رام چندر، عبدالکریم سرسیّد احمد خان، غلام غوث بے خبر، امیر مینائی، محمد حسین آزاد، چراغ علی، الطاف حسین حالی، محسن الملک، شبلی نذیر احمد، سرشار، شرر، ذکا اللہ، سجّاد حسین وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات درج ہیں۔

ساتواں باب دورِ جدید پر مشتمل ہے جس میں حالی، سرسیّد احمد، اکبر اور آزاد کی تصانیف اور حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ حالی کے مسدّس سے چند ادبی نمونے پیش کر کے اس دور کے ادبی رجحان کا تجزیہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

باب : چہارم

دیگر اہم مستشرقین

گارساں دی تاسی

انا ماری شمل

رالف رسل

ڈیوڈ میتھیوز

اور

سی شیکل

گارساں دی تاسی

گارساں دی تاسی کی ہندوستانی ادب کی تاریخ دو جلدوں میں پہلی بار سنہ ۱۸۳۹ء اور سنہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی دوسری اشاعت سنہ ۷۱-۱۸۷۰ء میں ہوئی جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

دی تاسی کے مطابق سولھویں صدی تک جدید ہندوستانی زبانوں نے سماج میں اپنا اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور یہ ویدوں کی مقدس زبانوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس زمانے میں ایسی زبانوں کو بھاشا یا بھاکھا اور خصوصاً "ہندوی" یا "ہندوئی" کے نام سے پکارا جاتا تھا لیکن محمود غزنوی کے حملے تک اس نئی زبان کی مکمل شکل دیکھنے کو نہیں ملتی۔ سترھویں صدی کے آخر میں دلّی میں پٹھانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد، ہندوؤں اور ایرانیوں کے آپسی میل جول کی وجہ سے فاتحین اور مفتوحین کی زبانوں کی ایک ملی جلی شکل وجود میں آئی۔ دہلی پر تیمور کی حکومت کے دوران اس میل جول نے اور مستحکم شکل اختیار کر لی۔ افواج کے لیے بازار شہر میں قائم کیے گئے تھے جسے تاتاری زبان میں "اردو" کہتے تھے یہیں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی ایک نئی زبان کی ابتدا ہوئی اور یہیں سے اسے اردو زبان کہنے کی روایت شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ اسے

"ریختہ" کہتے تھے۔ اسی زمانے میں جنوبی ہندوستان میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک نئی ملی جلی زبان نشوونما پا رہی تھی جسے "دکھنی" کا نام دیا گیا۔ ان دونوں بولیوں نے ہندوستان میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ حالانکہ الفاظ کے انتخاب کے اعتبار سے دونوں بولیوں میں فرق ہے لیکن زبان کی ساخت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں اور یہ "ہندی" یا "ہندکی" جیسے بہت سے ناموں سے اور خصوصًا یورپی علماء کے درمیان "ہندوستانی" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ زیادہ تر فارسی رسم خط کا استعمال ہوتا ہے لیکن ہندو اپنے بزرگوں کی طرح دیوناگری طریقۂ تحریر اختیار کرتے ہیں۔

وہ بول چال کی زبان کے طور پر "ہندوستانی" کو سارے ایشیا میں ایک شائستہ زبان مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فارسی کی ایک کہاوت کے مطابق مسلمان عربی کو مشرقی مسلمانوں کی زبان کی بنیاد پر ایک مکمل زبان کے روپ میں ترکی آرٹ اور آسان وسلیس ادب کے روپ میں فارسی کو فنونِ لطیفہ، تاریخ اور معیاری خط وکتابت کی زبان کی روپ میں مانتے ہیں۔

دی تاسی کہتا ہے کہ ہندوستان میں جو زبان سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس میں ادبی قوت اور شائستگی اور عام مقبولیت پائی جاتی ہے وہ ہندوستانی ہی ہے۔ اس کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ زبان روز ایک نئی جہت سے روشناس ہوتی ہے۔ دفتروں اور عدالتوں میں اس نے فارسی کی جگہ حاصل کر لی ہے اور یقینًا جلد ہی سیاسی

میدان میں بھی اپنا مقام حاصل کرلے گی ۔

دی تاسی کے مطابق "ہندوستانی" ایک ایسی زود ترقی یافتہ زبان ہے جس نے کچھ ہی عرصے میں ہر میدان میں اپنی دھاک جمالی ہے ۔ جس طرح یورپ میں عیسائی اصلاح پسندوں نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے اس زمانے کی زندہ زبانوں کو ذریعہ ترسیل بنایا ۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے عظیم اصلاح پسندوں اور مبلغین نے اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے ہندوستانی کا استعمال کیا ۔ ان بزرگوں میں کبیر نانک، دادو، ویربھان، بختاور اور سید احمد جیسے لوگ اہم ہیں ۔ یہ تصانیف ہندوستانی میں ہیں اور ساتھ ہی ان کے ماننے والے اسی زبان کا استعمال کرتے ہیں ۔

ہندوستانی ادب کا اپنا ایک الگ مقام ہے جو کسی دوسری زبان کے ادب سے کسی طرح کمتر نہیں ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ادب میں ایک طرح کے اپنے پن کی کیفیت ہوتی ہے جو اسے دلکش بناتی ہے اور یہ خصوصیت ہندوستانی میں پائی جاتی ہے ۔ دی تاسی ہندوستان کو فن شاعری کے معاملے میں بہت مقبول ملک سمجھتا ہے ۔ یہاں کی تمام ادبی داستانیں تاریخ، اخلاقی قصے اور لغات وغیرہ شاعرانہ انداز میں ملتی ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستانی ادب کا ایک بہت بڑا حصہ فارسی، سنسکرت اور عربی سے ماخوذ ہے لیکن یہ فن پارے ان سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں ۔

"ہندوی" کی روایت بارہویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور جنوب کے مسلمان مصنفین کی تیرہویں صدی سے ۔ لیکن اس زبان و ادب نے باقاعدہ مقبولیت اٹھارویں صدی میں حاصل کی ۔ اس زبان کو ہردلعزیز بنانے والوں

میں سودا، میرا اور میر حسن شامل ہیں۔ دکنی کا رواج سولھویں صدی سے شروع ہوتا ہے وہ ہندوستانی کی جن مشہور تخلیقات کا ذکر کرتا ہے ان میں میر کی "نکات الشعراء"، مصحفی کی "تذکرۂ شعرائے ہندی"، فتح علی حسینی کی "تذکرۂ شعرائے ہندی"، نواب علی ابراہیم خاں کی "گلزار ابراہیم"، لطیف کی "گلشن ہند"، بینی نرائن کی "دیوان جہاں" اور منولال کی "گل دستۂ نشاط" شامل ہیں۔

ہندوستانی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس پر فارسی اور عربی کے اثرات حاوی ہیں کیونکہ اس میں عروض کی وہ ساری پابندیاں ملتی ہیں اور ساتھ ہی قافیہ و ردیف کی وہی بندشیں اس میں پائی جاتی ہیں۔

ریختہ میں شاعری کے مختلف اندازِ بیان کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

۱۔ ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی میں لکھا جا سکتا ہے جیسا کہ خسرو کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

۲۔ اس کا الٹا یعنی پہلا مصرع ہندی اور دوسرا فارسی میں لکھا جا سکتا ہے جس کی مثال میر واعظ کے یہاں ملتی ہے۔

۳۔ فارسی الفاظ کا استعمال ہندوستانی سیاق و سباق میں۔

آگے چل کر وہ ادب کی مختلف اصناف کا بھی ذکر کرتا ہے جن میں قصیدہ، ہجو، قطعہ اور خیال، غزل، چیستان، بیان، تذکرہ، تضمین، ترانہ، تشبیب، تعریف وغیرہ شامل ہیں اور ان کی تعریفیں بھی بیان کرتا ہے ساتھ ہی نکتہ، فرد، بند، بیاض، بیت، دوبیتی، چار بیت، منقبت، مرثیہ، مثنوی، پندنامہ، معمہ، مبارک باد، مسمط، مولود، رسالہ، رباعی، واسوخت، شکارنامہ، سلام، سرود، ساقی نامہ، سوز، ہزلیات کی بھی تعریفیں پیش کرتا ہے۔

مختصراً ہندوستانی ادب کی تاریخ نگار ساں دی تاسی کے مطابق دس ہزار

عیسوی محمود غزنوی کے حملے سے ہموار ہونی شروع ہوتی ہے اور چار صدی بعد
جب دہلی پر مغلوں کی حکومت قائم ہوتی ہے تب تک اس زبان نے خود کو
مختلف زبانوں کے الفاظ سے مالا مال کر لیا تھا۔
رسم خط کے سلسلے میں دی تاسی کا خیال ہے کہ جب تک مسلمانوں کی حکومت
ہندوستان پر قائم رہی سارے ہندوستان میں اُردو، فارسی رسم خط کے
ذریعے تعلیم دی جاتی تھی اور بہت دنوں تک انگریزی سرکار نے بھی یہی
پالیسی جاری رکھی ۔ ۱۸۳۱ء میں ہندوستان میں مختلف علاقوں میں مختلف
زبانوں کے استعمال کی وجہ سے مختلف صوبوں میں ان کی علاقائی زبانوں
کو اہمیت دی گئی ۔ اردو جنوب اور جنوب مغرب کے صوبوں میں اپنائی گئی۔
اسے سب نے پسند کیا اور اس سلسلے میں کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی ہندوستان
کی مختلف تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے اس زمانے میں ہندوؤں
کی ایک ایسی تحریک بھی ابھری جو اردو کے سارے راستے بند کر دینا چاہتے
تھے ۔ فارسی رسم خط ہونے کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ اس پر مسلمانوں کے
اثرات حاوی ہیں ۔ اپنی اس رجعت پرستی کی وکالت کرتے ہوئے جو
دلائل پیش کیے گئے ہیں انھیں قطعی تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ اس زمانے کا ذکر
ہے جب ہندی اور اُردو کی تفریق وجود میں آ چکی تھی ۔ ہندی کے حامیوں
کی تنقید کرتے ہوئے دی تاسی لکھتا ہے کہ "یہ لوگ قومی تنگ نظری کے
شکار ہیں ۔ اس کے خیال کے مطابق اردو با قاعدہ طور پر اپنا ادبی مقام
حاصل کر چکی ہے اور سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ ہندو
فارسی رسم خط پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ خوبصورت نہیں ہوتے اور شکستہ
الفاظ کو پڑھنے میں دقّت ہوتی ہے جبکہ بات اس کے برعکس ہے اور

بھدی گھسیٹ میں لکھی ہوئی ناگری پڑھنا زیادہ مشکل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے اس چیلنج کو بہت بہادری کے ساتھ تسلیم کیا ہے اور سخت جوابات بھی دیئے ہیں۔

اپنی تاریخِ ادب میں گارساں دی تاسی نے ہندوستانی ادب کے ارتقاء کا عہد بعہد جائزہ لیا ہے۔ یہ سلسلہ گیارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے مختلف علمار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تخلیقات کی علاقہ بندی بھی کی ہے۔ مثلاً شمالی ہند کے علماء میں ابوالفضل اور بایزید انصاری اور دکنی ادب میں محمد افضل اور محمد قلی قطب شاہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کو وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جس میں گنگا پتی، ویر بھان، میر، میر حسن، سودا، آرزو، درد، یقین، فغاں، امجد امین الدین، عاشق غازی پوری وغیرہ کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

انا ماری شمل

شمل کے مطابق ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلم مخالف طاقتوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف ایک طرح کا جہاد چھیڑ دیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستانی سیاست کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جب ہندوستان پر برطانوی حکومت قائم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے مشرقی علوم کی طرف مغرب کے علماء کی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی چاہے وہ ہندوستانی ہو یا فارسی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جو کام ہندوستانی علوم کے میدان میں ہوئے ان کی روشنی میں بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انگریز مقامی لوگوں پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکے —— فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر کی تخلیق کی حیثیت قطعی مصنوعی تھی اور چند علماء سرکاری طور پر اس کام کو انجام بھی دے رہے تھے تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انگریزوں کو چاہے اور جس میدان میں دلچسپی رہی ہو اردو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی جو میکالے کے نظریات کی شکل میں ہندوستان میں تعلیمی پالیسی متعین کرتے وقت ہمارے سامنے آئی ہے۔ فارسی جو صدیوں سے انتظامیہ، اعلیٰ تعلیم، تاریخ نویسی اور شاعری کی زبان تھی، ۱۸۳۷ء میں اس کی یہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور ۱۸۴۲ء میں فورٹ ولیم

کالج میں اردو کو ذریعہ امتحانات کا درجہ مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ انگریزوں
میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو نہ صرف اردو بلکہ تمام مقامی زبانوں اور علوم کی
ترقی پر زور دیتا تھا، جس کی اعلیٰ مثال سربارٹل فریئر Sir Bartle Frere
جیسا شخص ہے جس نے سندھی زبان کو تحریری شکل دی۔ اس کے علاوہ پشتو
اور پنجابی میں بھی وسط انیسویں صدی میں کافی کام ہوا جن میں ارنسٹ ٹرمپ
Ernst Trumpp کا نام اہم ہے۔ اس کے علاوہ جوزف وان
ہمیر پرگسٹال Joseph von Hammer Purgstall ——————
جو آسٹریلیا کا رہنے والا تھا اس نے ہندوستانی ادب پر کئی مضامین لکھے اور
یورپی علماء کی توجہ "ہفت قلزم" کی طرف مبذول کرائی جو ۱۸۱۴ء میں لکھنؤ سے
شائع ہوئی۔

ہندوستانی ادب کے میدان میں جن علماء نے انیسویں صدی
میں درحقیقت کوئی نمایاں کام کیا ہے ان میں فرانسیسی ادب کا گارساں دی
تاسی کا نام سرفہرست ہوگا جس نے ۱۸۲۸ء میں پیرس میں ہندوستانی زبان و
ادب کی تعلیم دینی شروع کی۔ اس کے علاوہ جرمن زبان میں امانت کی اندرسبھا
کے تراجم نے اردو ادب کو یورپ کے لوگوں تک پہنچانے میں مدد کی۔ یہ ۱۸۵۳ء
میں واجد علی شاہ کے دربار میں کھیلے گئے ناٹک اندرسبھا کے ترجمے ہیں۔
مجموعی طور پر اردو کا دائرہ بہت محدود تھا اور یونیورسٹیوں میں اس زبان
کی تعلیم کے لیے شعبے کھولنے پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ اسی
طرح سے جیسے انیسویں صدی تک یا بعض اعتبار سے ۱۹۳۰ء تک ترکی زبان کے
ساتھ جو سلوک کیا گیا کچھ اسی طرح کی بے توجہی کا سامنا اردو کو بھی کرنا پڑا۔
یہ سچ ہے کہ اردو شعراء نے فارسی کے رائج روایتی انداز کو اپنایا لیکن یہ سمجھنا

غلط ہوگا کہ فارسی سے الگ اردو کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اکثر یہ بھی کہا گیا ہے کہ
اردو شاعری میں ہندوستانی سماج کے جو مقامی اثرات نمایاں ہیں وہ
اسے فارسی شاعری سے الگ کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ترکی زبان کی
طرح اردو نے بھی فارسی کے ذخیرے سے بہت سے الفاظ مستعار لیے۔ فارسی
شاعری کی طرح اردو شاعری میں بھی وہ صوفیانہ تصوّرات وراثت میں ملے
لیکن ان کا سیاق وسباق ہندوستانی تھا۔ اردو شاعری جن عظیم فارسی
شعراء کے خیالات سے متاثر ہوئی ان میں رومی اور عطار کی صوفیانہ شاعری
ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں فارسی کی طرح عاشق کا کرب اور
محبوب سے جدائی مرکزی خیال ہے۔ اسی طرح منصور، شیریں، فرہاد اور لیلیٰ
مجنوں کے قصوں کی تصویر کشی عربی اور فارسی کی طرح اردو شعراء کے یہاں
بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو شاعری میں جو مشترک
اقدار ہیں ان میں شاعر یا عاشق کا ناصح یا شیخ سے جھگڑا بھی ہے۔

رالف رسل

حال ہی میں رالف رسل لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورنٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں ریڈر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ اب تک ان کے تین تحقیقی مقالے، تھری مغل پوئٹس Three Mughal Poets ، ۱۹۶۹ء، غالب لائف اینڈ لیٹرز Ghalib: Life and Letters ________ ۱۹۶۹ء اور غالب: دی پوئٹ اینڈ ہز ایج Ghalib the Poet and His Age ________ ۱۹۷۲ء کتابوں کی شکل میں شائع ہوچکے ہیں۔ اس لحاظ سے گو انھوں نے باقاعدہ اردو ادب کی کوئی تاریخ نہیں لکھی لیکن اردو ادب کے مختلف ادوار کے مطالعے کے سلسلے میں ان کے ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے جس سے مستشرقین کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

________ Three Mughal Poets کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ اردو برصغیر ہندوپاک کی درجنوں یا اس سے بھی زیادہ زبانوں میں سب سے زیادہ مکمل زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک مخصوص جغرافیائی علاقے کی زبان نہیں۔ گو کہ اس کا اصل وطن اتر پردیش اور دلی کے آس پاس کے علاقے ہیں لیکن اردو بولنے والے تمام ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے

ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اردو بولنے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن اسے صرف مسلمانوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اردو ادب ان لوگوں کی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے جو اسلام مذہب کے ماننے والے ہیں۔ اردو ادب کی جو موجودہ شکل آج ہمارے سامنے ہے اس کا سلسلہ اٹھارویں صدی کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔

برصغیر کی ایک بہت ہی اہم زبان ہونے کے باوجود ان کے نزدیک اردو ادب انگریزی بولنے والوں کو بہت زیادہ متاثر نہیں کرتا۔ اس کی تاریخی وجوہات ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء سے پڑ جاتی ہے جو انگریزوں کو باقاعدہ بنگال کا حکمراں بنا دیتا ہے۔ اس وقت تک میرؔ اور سوداؔ ادبی دنیا میں ایک مستند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن نصف صدی تک اردو کے اہم مراکز برطانوی حکومت کی حد بندیوں سے باہر ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک معدودے چند انگریز ہی اس سے واقف ہو پاتے ہیں لیکن انیسویں صدی کے شروع میں جب انگریزوں کا اقتدار بڑھتا ہے اور دلّی پر ان کی حکومت قائم ہوتی ہے، اردو کا میدان اور بھی وسیع ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی حکومت کی طرف سے اردو کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔

ہندوستانی ادب کو نظر انداز کرنے کا سہرا میکالے کے سر ہے جس نے نہ صرف ہندوستانی ادب بلکہ ایشیائی علوم کو سرے سے بے بنیاد اور غیر اہم قرار دیا۔ مقامی زبانوں کو غیر ضروری بتاتے ہوئے اس نے ان بولیوں کو ضعیف اور غیر شائستہ قرار دیا۔ یہاں میکالے کے تمام اقوال کا تجزیہ ممکن نہیں لیکن بنیادی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اس رویّے سے ہندوستانی ادب

کی طرف ایک غیر ہمدردانہ فہم کا احساس ہوتا ہے۔ یہ رویّہ وکٹوریائی عہد تک ختم نہیں ہوتا بلکہ ہمارے دور تک جاری ہے جس کے ذریعے انگریزی کو مسلط کرنے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔ رسل کہتے ہیں کہ یہ صرف ہماری ہی رائے نہیں ہے بلکہ برطانوی امور خارجہ کے دفتر نے ۱۹۴۴ء میں جو اسکاربرو کمیشن Scarbrough Commission مشرقی علوم کے سلسلے میں بٹھایا، اس کی بھی یہی رائے تھی۔ اس کمیشن کی رپورٹ ۱۹۴۷ء میں چھپی، میکالے منٹ کی تنقید کرتے ہوئے اس میں کہا گیا کہ ایسا رویّہ جو کسی تہذیب کو حقارت آمیز نظر سے دیکھتا ہے، صحیح نہیں۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تحریک آزادی کے شروع ہوجانے کے بعد برطانوی حکمرانوں کی جو دلچسپی ہندوستانی تہذیب میں ظاہر ہونے لگی تھی وہ پھر سے زائل ہونے لگی کیونکہ اس وقت ان کی کوشش ادب اور آرٹ کی خدمت نہیں بلکہ اقتدار بچانے کی طرف منتقل ہوگئی اور جس نے میکالے کے خیالات کو تقویت بخشی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پورے دور میں انتظامیہ کو بہتر طور پر چلانے کے لیے اردو کی اہمیت کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن اردو ہندوستانی فوج کی دلچسپی کا مرکز نہ بن سکی۔

اس اردو کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے رسل اردو ادب کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی عہد بعہد تاریخ کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ۱۵۲۶ء میں بابر کے حملے کے بعد مغلیہ سلطنت کا قیام وجود میں آتا ہے اور اکبر کے تخت نشین ہونے تک اس کی جڑیں ہندوستان میں مستحکم ہوجاتی ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی اکبر ادب اور آرٹ کا دلدادہ تھا اور اس نے اپنے دربار میں ایسے عالموں کی

سرپرستی کی۔ یہ وہ دور ہے جب اردو ایک باقاعدہ زبان کی حیثیت سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ مختلف غیر ملکی زبانوں کے اثرات سے جو ایک ملواں زبان جنم لے رہی تھی اس نے نہ صرف عوام بلکہ درباروں کو بھی متاثر کیا اور مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر جیسے شاعر کو بھی جنم دیا۔ ظاہر ہے بہادر شاہ ظفر تک پہنچتے پہنچتے انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا باقاعدہ قبضہ جما لیا تھا اور دلّی جو اب تک اردو سرگرمیوں کا مرکز تھی، اس کی وہ حیثیت نہیں رہ جاتی اور اردو نوابین اودھ کے دربار میں پناہ حاصل کرتی ہے۔

اس کتاب کو مصنف چھ حصّوں میں تقسیم کرتا ہے:

۱۔ اٹھارویں صدی کا پس منظر

The Eighteenth Century Background

۲۔ سوؔدا کی ہجویات

The Satires of Sauda

۳۔ میر حسن کی سحر البیان

Mir Hasan's "Enchanting story"

۴۔ میر کی عشقیہ شاعری

The Love Poetry of Mir

۵۔ میر اور عاشق کا طرز زندگی

Mir and lover's way of Life

۶۔ میر بحیثیت انسان اور ان کا عہد

Mir: The Man and His Age

پہلے باب میں (اٹھارویں صدی کے پسِ منظر) میر، سوؔدا اور میر حسن کا ذکر کرتے ہوئے مصنّف کہتا ہے کہ یہ شعرا ایک ایسے سماج میں رہ رہے تھے

peas جو یورپی دور وسطیٰ سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ اکثریت دہقانوں کی تھی اور ایک طرح سے سماج کی معیشت کا دارومدار انھیں پر تھا ants سارے سماج کا ایک طے شدہ نظام ہوتا تھا جس میں سب سے اعلیٰ مقام بادشاہ کو حاصل تھا جس کے ہاتھ میں سارے اختیارات مرکوز تھے۔ ہر خاص و عام کو اس کا وفادار ہونا لازمی تھا۔ بادشاہ کی ذمہ داری کی تھی کہ وہ اپنے عوام کو تحفظ دے اور ان کو آرام و آسائش کا سامان بہم پہنچائے۔ زمین دار اسے اپنی کاشت کا مقررہ حصہ بطور نذرانہ پہنچائے۔ بادشاہ کے بعد امیرزادوں کا مقام تھا جو بادشاہ کے توسط سے بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے۔ اس کے بدلے میں جب بھی بادشاہ کو ضرورت ہوتی تھی اس کی خدمت کے لیے تیار رہنا ہوتا تھا۔ خصوصاً ان کا فرض بادشاہ کو وقت ضرورت فوجی امداد فراہم کرنا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں نظریاتی طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایسے سماجی نظام کے ذریعے ہی عوام کی خوشحالی اور امن کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ سماج کا ہر فرد زندگی کے ہر ضروری شعبے میں دخل رکھتا تھا۔ عہد وسطیٰ میں عشق اور شادی دو الگ الگ چیزیں ہیں جس کی جھلک اس زمانے کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

شعراء کی سرپرستی کو اس زمانے کے شرفاء باعث فخر سمجھتے تھے۔ جو ان کی سماجی حیثیت کو اور بلند کرتی تھی۔ چونکہ یہ شعراء ان شرفاء کی شان میں قصیدے لکھا کرتے تھے جن کے بدلے میں وہ انعام پاتے اور اس طرح وہ اپنے سرپرست کی تعریف کے پل باندھنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے رہتے تھے لیکن میرؔ اور سوداؔ و میر حسنؔ ایسے شعراء میں سے ہیں جن کے یہاں آزادیٔ فکر ہے اور جیسا وہ محسوس کرتے ہیں اس کی عکاسی اپنی شاعری

ییں کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان شعراء کے یہاں بادشاہوں اور شرفاء کے خلاف احتجاج بھی ملتا ہے۔ اس کی مثال سوداؔ کا وہ مشہور قصہ ہے جس میں بادشاہ ان سے پوچھتا ہے کہ دن بھر میں کتنے اشعار کہہ لیتے ہیں۔ سوداؔ جواب دیتے ہیں کہ جب طبیعت موزوں ہوتی ہے تو تین چار اشعار کہہ لیتا ہوں۔ اس پر بادشاہ کہتا ہے کہ تین مکمل غزلیں تو میں پاخانے میں بیٹھ کر کہہ لیتا ہوں۔ سوداؔ نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے اس میں سے ویسی ہی بو بھی آتی ہوگی۔ اس کے علاوہ جب بادشاہ کی طرف سے یہ تجویز آتی ہے کہ وہ سوداؔ کو درباری شاعر بنانا چاہتا ہے تو سوداؔ جواب دیتے ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے عطا کیا گیا یہ درجہ ان کی شاعری کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے بہت سے قصے میرؔ کے بارے میں بھی مشہور ہیں۔

اس زمانے میں شاعری کی تین اصناف غزل، قصیدہ اور مثنوی اہم ہیں جن میں غزل کا مقام سب سے بلند ہے۔ یہ اصناف فارسی سے اردو میں اسی طرح سے آئیں جیسے اطالوی سے انگریزی میں سانٹ آیا۔

اس دور کا سیاسی اور سماجی پس منظر رسل ۱۵۲۶ء (بابر کے دور سے) کرتے ہیں جب وہ ہندوستان پر حملہ کرتا ہے اور پانی پت کی پہلی لڑائی میں فتح حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی جڑیں مضبوط کرنے کا سہرا اکبر کے سر ہے جو ۱۵۵۶ء کو تخت نشین ہوا۔ مصنف نے مغل خاندان کے تمام بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کی رسومات اور ادبی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ لیکن یہ تذکرے ان تین شعراء کی زندگی کے دائرے تک محدود ہیں۔ دوسرے باب میں سوداؔ کی ہجویات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور شعری نمونے مع ترجمہ پیش کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں میر حسنؔ کی

زندگی سے متعلق ضروری معلومات درج ہیں۔ اس دور کے سماج میں مثنوی کے مرتبے پر تبصرہ کرتے ہوئے سحرالبیان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں میر کی عشقیہ شاعری پر بحث کی گئی ہے جن میں ان کی مشہور مثنویات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ ان میں دریائے عشق کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا اور کلام کے نمونے مع ترجمہ پیش کیے گئے ہیں۔ پانچویں باب میں میر کی شاعری عاشق کی زندگی اور اس کے مقام کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں مصنف عشق مجازی اور عشق حقیقی کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میر کی شاعری کی بنیاد عشق حقیقی پر ہے اور اس طرح ان کی شاعری کا عاشق وہ ہے جو خدا کی بے پناہ محبت میں گرفتار ہے۔ چھٹے باب میں میر کی شخصیت اور دور کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میر کی شاعری کا دار و مدار رنج والم پر ہے۔

ڈیوڈ میتھیوز

اور

سی شیکل

ڈیوڈ میتھیوز اور سی. شیکل لندن یونیورسٹی کے اسکول آف منٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں اردو کے اساتذہ ہیں. گو انھوں نے باقاعدہ اردو ادب کی تاریخ نہیں لکھی لیکن اپنی تصنیف، An Anthology of Classical Urdu love Lyrics میں اردو شاعری کے کلاسیکی سرمائے پر بحث کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے ان کے تاریخی شعور اور رویّے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ڈیوڈ میتھیوز اور شیکل اردو ادب میں غزل کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔[۱]

ان کے نزدیک غزل کی ابتدا عباسیہ دور سے ہوتی ہے اور پہلا غزل گو ابونواس Abu Nuvas ہے جس نے ۸۱۳ء میں انتقال کیا. گو کہ غزل کی روایت عربی شاعری سے شروع ہوتی ہے لیکن اسے سب سے زیادہ فروغ فارسی ادب نے دیا اور آج بھی غزل اسی فارم میں لکھی جاتی ہے۔

جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے چونکہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے دور میں فارسی ادبی زبان تھی، اس لئے ہندوستانی زبان میں اسی

لب و لہجے اور فارم کا تسلسل برقرار رہا۔ اس کی مثال امیر خسرو کے یہاں ملتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان فارسی شاعری کی ترقی میں ایران سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کرلیتا ہے۔ مغل دربار میں بہت سے شعراء نے شہرت حاصل کی جو فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو ایرانی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو خالص ہندوستانی حیثیت رکھتے تھے ان میں فیضی اور بے دل جیسے عظیم شعراء ہیں جنھوں نے فارسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ یہ سلسلہ ہندوستان میں اقبال تک جاری رہا اور اردو برصغیر کے مسلم شرفا کے شعری اظہار کی زبان بن گئی۔ ۲ے

اردو زبان و ادب پر فارسی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ تمام عظیم غزل گو فارسی داں تھے اس لیے اردو شاعری کو فارسی سے الگ کرکے دیکھنا مناسب نہ ہوگا۔

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس وقت جب شمالی ہندوستان میں مغلوں کی حکومت تھی، جنوب میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جن میں زیادہ تر شیعہ فرقے کے بادشاہ حکمرانی کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم بیجاپور اور گول کنڈہ کا علاقہ ہے۔ ادبی تاریخ کے نقطۂ نظر سے فارسی کے ساتھ ساتھ ان درباروں میں اردو کو بھی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس طرح اردو جو فارسی اور شمالی ہند کی بولیوں کا مرکب ہے پہلی مرتبہ جنوب میں ادبی زبان کی شکل حاصل کرتی ہے جو شمال کے مسلم حملہ آوروں کے ذریعے ایک نوآبادیاتی زبان کے روپ میں پہنچی تھی۔ ۳ے

جنوبی ہند کی یہ زبان جسے دکنی یا دکھنی کہتے ہیں، زبان کے جدید معیاروں کے تحت کئی لسانی خط و خال کی حامل ہے اور اس میں لکھا ہوا ادب ایک

عظیم اور نایاب ذخیرے کی اہمیت رکھتا ہے۔ دکن کے عظیم شعرا میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نام بہت اہم ہے جن کے سلیس درباری نغمے اور گہری جذباتی وابستگی کی حامل مذہبی شاعری دلوں کو چھو لیتی ہے۔

اردو غزل کی اس روایت نے جو دکن میں عام ہوئی دہلی کی شاعری پر اپنے اثرات چھوڑے۔ اس حقیقت کو اگر تہذیبی اور تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی وجہ اورنگ زیب کے دکن پر حملے اور دو تہذیبوں کے درمیان باہمی ربط و ضبط میں مضمر ہیں اردو زبان و ادب کی تیزی سے فروغ پانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ایران اور اسلامی ممالک سے تعلقات کمزور پڑ گئے تھے جو اردو کو فارسی کی جگہ دینے میں معاون ثابت ہوئے اس طرح اردو شمالی کے مسلم شرفا طبقے کی شعری زبان بن جاتی ہے۔

ان کے مطابق دلی میں اردو غزل کی مقبولیت ولی کی آمد سے اور بھی بڑھ جاتی ہے جہاں دکن کی بہت سی روایات کو تسلیم کیا گیا۔ ولی کی طرح بیان کی سادگی اور تازگی جن دوسرے شعرا میں پائی جاتی ہے ان میں سراج دکنی کے علاوہ دلی کے شعرا میں حاتم اور مظہر اہم ہیں۔ لیکن دلی سیاسی نشیب و فراز کی وجہ سے اردو شاعری کی ترقی کا اہم مرکز نہ بن سکی۔ اسی زمانے میں مسلم شرفا کی تہذیب میں ایک غیر معمولی تبدیلی آتی ہے اور اردو شاعری نوابین اودھ کے دربار میں پہنچتی ہے۔ اس کی وجہ بھی دلی پر نادر شاہ کا حملہ اور طرح طرح کی سیاسی کشمکش ہے جس کی بنا پر بہت سے شعرا نے دربار اودھ میں پناہ لی ان میں سودا اور میر جیسی بزرگ ہستیاں شامل ہیں۔ ان کے بعد اردو شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ تر شعرا ایسے ہیں جن کا لڑکپن تو دلی میں بیتا لیکن ادبی سرپرستی لکھنؤ

کے دربار میں ملی۔ ان میں جرأت، مصحفی اور انشاء کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب شاعری میں زبان کے طرح طرح کے تجربے ہو رہے تھے اور خاص طور پر لکھنؤ کے شعراء نے فنِ شاعری کو صنائع بدائع اور الفاظ کی تراش وخراش تک محدود کر دیا تھا اور شاعری کا عشقیہ انداز ابھر کر سامنے آتا ہے اس روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ناسخ، آتش اس دور کے آخری شاعر ہیں کیونکہ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کا اودھ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ادب اور آرٹ کے میدان میں اودھ کو جو مرکزی اہمیت حاصل تھی وہ ختم ہو جاتی ہے۔

انگریزوں نے لکھنؤ اور دلی کی تہذیبی روایات کو برقرار رکھنے کی مصنوعی کوشش تو کی لیکن وہ ادبی جوش وخروش باقی نہ رہا۔ یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اسی زمانے میں دہلی میں اردو شاعری کا بہترین کلاسیکی ادبی سرمایہ وجود میں آتا ہے جس میں سب سے زیادہ اہمیت غزل کو حاصل ہے۔ اس وقت اردو ادب کی سرپرستی مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کر رہے تھے۔ ان میں شیفتہ جیسے نفاست پسند ادیب تھے اور اس چھوٹی سی دنیا میں تین عظیم شخصیتیں غالب، مومن اور ذوق کی تھیں۔ جن کے اسلوب نے اردو غزل کو نئے خیالات سے ہم آہنگ کیا۔

میتھیوز اور شیکل غالب کو تمام اردو شعراء میں سب سے عظیم تصور کرتے ہیں اور اس دور کو دہلی اسکول کی شاعری کا دوسرا دور مانتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ادب میں بھی ایک زبردست انقلاب نمودار ہوتا ہے۔ اردو ادب کی کلاسیکی روایات کو داغ دہلوی نے ایک نیا مزاج دیا ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران داغ کو مجبوراً دہلی چھوڑنی پڑی اور انھوں نے کچھ دنوں تک نواب رام پور کی سرپرستی میں سکونت اختیار کی

اور کچھ عرصے بعد نظام حیدر آباد کے دربار میں مقیم رہے۔ اس طرح اردو کی کلاسیکی شاعری دکن کی زمین سے شروع ہوئی اور اسی زمین پر اختتام پذیر بھی ہوئی۔ داغ کی شاعرانہ عظمت پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ان کی شاعری میں دلکشی اور حسن اور بامحاورہ زبان ہونے کے باوجود ان کے یہاں قوتِ بیان کا قحط ہے۔

یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں بادشاہت کے خاتمے کے بعد متوسط مسلم طبقہ ابھر رہا تھا اور ایسی تبدیلی ادب میں بھی ظہور پذیر ہوئی حالی جیسے ادیب جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اسی زمانے کی دین ہیں۔ حالی کی شہرت شاعری کی نئی معیار سازی اور غزل کے فنی شعری قواعد وضوابط نیز ان کے مسدس کی وجہ سے ہوئی لیکن غزل میں ان کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی اس طرح یہ دور غزل کے زوال کا دور کہا جا سکتا ہے جس میں اقبال جیسے شاعر غزل کے نہیں بلکہ نظم کے میدان میں شہرت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن غزل کا یہ زوال پذیر انداز حسرت کی شاعری میں نئے زاویے پیش کرتا اور غزل میں مختلف سیاسی خیالات کے راستے کھول کر اس کا کینوس اور بھی وسیع کرتا ہے۔

غزل کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے ان علماء کی مراد یہ نہیں کہ غزل کی سماجی اور ادبی حیثیت ہی نہیں رہ گئی بلکہ نئے سیاسی اور سماجی حالات میں غزل کو نئے موضوعات اپنے دامن میں سمیٹنے چاہئیں جس سے غزل کی معنویت میں اضافہ ہو اور غزل کی سماجی حیثیت بنی رہے۔

اس طرح اگر اردو ادب کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ غزل ایک عرصۂ دراز تک درباروں اور شرفا کی تفریح طبع کا سامان بنی رہی۔ باطنی طور پر غزل نے بہت سے روایتی اور پہلے سے طے شدہ عناصر کو ترک

بھی کیا لیکن شاعری میں استاد اور شاگرد کی روایت برقرار رہی جس کے
ذریعے کوئی نیا شاعر کسی شہرت یافتہ استاد کی شاگردی اختیار کر کے ہی خود کو
نمایاں اور مقبول کر سکتا ہے۔

حواشی و حوالے

D.J.Mathews and C.Shackle:

An Anthology of Classical Urdu Love Lyrics

"Although its history in Urdu is relatively short the Ghazal is, by European standards, a poetic form of great age". Page:2

" اگرچہ اردو میں اس کی تاریخ مقابلتاً مختصر ہے لیکن مغربی معیار کے اعتبار سے غزل عظیم دور کا ایک شعری اسلوب ہے "

"----while later under the Mughals India became a more important centre than Iran itself for the cultivation of Persian poetry. At the Mughal court there flourished a large number of

distinguished poets, writing Ghazal in Persian including Persian poets drawn from Iran by Mughal patronage and others born in India. Among the latter the greatest were Faizi (d.1595) and Bedil (d.1721), the last great poet of India to use Persian as a living, natural means of expression. Thereafter, although significant Persian poetry continued to be written in India untill the time of Iqbal (d.1938) Urdu became the prime medium of poetic expression for the Muslim elite of the sub-continent." Page: 3

۲ے "۔ ۔ ۔ دوسری طرف مغلوں کے دور میں ہندوستان فارسی شاعری کا ایران سے بھی زیادہ اہم مرکز بن گیا۔ مغل دربار میں بڑی تعداد میں ایسے منفرد شعراء پیدا ہوئے جو فارسی میں غزلیں لکھتے تھے۔ ان میں کچھ ایرانی شعراء بھی شامل تھے جنھیں مغلوں کی سرپرستی ہندوستان کھینچ رہی تھی۔ کچھ ایسے شعراء تھے جو خود ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان میں دو نام سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک فیضی کا نام (وفات ۱۵۹۵ء) اور دوسرا بیدل کا (وفات

۱۷۲۱ء)۔ بیدل ہندوستان کے وہ آخری عظیم شاعر تھے جنھوں نے فارسی کو اظہار کا ایک زندہ اور فطری وسیلہ بنایا۔ اس کے بعد اگرچہ اقبال (وفات ۱۹۳۸ء) کے دور تک ہندوستان میں فارسی شاعری ہوتی رہی اور خاصی اہمیت بھی رکھتی ہے لیکن اردو برصغیر کے مسلم اشرافیہ کے لیے شعری اظہار کا خاص وسیلہ بن گئی۔"

"--- there thus arose the paradoxical situation that Urdu, in origin an ama lgam of Persian and northern Indian dialects, was first cultivated as a li terary language in South India where it had been brought as a colonial Language by Muslim invaders from the north."Page: 3

۳۔ ۔ ۔ ۔اس طرح ایک عجیب و غریب صورتِ حال پیدا ہوئی کہ وہ اردو جو فارسی اور شمالی ہندوستان کی بولیوں کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی تھی اسے ادبی زبان کی حیثیت جنوبی ہندوستان میں ملی جہاں یہ شمال کے مسلم حملہ آوروں کے ساتھ ایک استعماری زبان کی حیثیت سے پہنچی تھی۔"

باب: پنجم

برطانوی مستشرقین کی ادبی خدمات کا تجزیہ

مستشرقین سے ہندوستان اور بالخصوص اردو کا رابطہ سترھویں صدی سے شروع ہوا۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ رابطہ دوہری نوعیت کا تھا۔ ایک طرف مستشرقین تھے جو ہندوستان کی قدیم تاریخ اور تہذیب کو اپنی علمی یا عملی ضرورتوں کی بنا پر سمجھنا چاہتے تھے اور کسی ملک اور اس کی تہذیب کے بارے میں واقفیت، وہاں کی زبانوں اور وہاں کے ادبیات کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں اور ان زبانوں کی ادبیات کو سیکھنے کی کوشش کی۔

اس دور میں اردو نہ صرف عملاً سرکاری زبان تھی بلکہ ہندوستان کے تقریباً ہر علاقے میں سمجھی جانے کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ سرکاری زبان ہونے کی بنا پر انتظامیہ کی اصطلاحیں عدالتوں کی اصطلاحات اور دفاتر میں کام آنے والے الفاظ اسی زبان کے رائج تھے۔ اس بنا پر انگریز اور یورپی مستشرقین کا اردو کی طرف متوجہ ہونا بڑی حد تک لازمی تھا۔

دوسرے وہ مستشرقین تھے جو یورپ کے نشاۃ ثانیہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے غلط یا صحیح یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان ایک تہذیبی طور پر پسماندہ ملک ہے جس کو یورپ کی خبر و نظر سے فیض پہنچانا ان کا تاریخی فرض ہے۔ یعنی وہ ہندوستانی

زبانوں اور ان کے ادب کو یورپ کی نظر سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتے تھے اور یہاں کے ادب کی تاریخ اور تفہیم یورپی نظر اور مغربی پیمانوں سے کرنا چاہتے تھے۔

ان کے سامنے بہت بڑی دشواری یہ تھی کہ ان کا سابقہ جس ملک، جس زبان اور جس ادب سے ہوا وہ ان کے اپنے ملک، اپنی زبان اور اپنے ادب سے بالکل مختلف تھا۔ اس لیے جگہ جگہ پر یورپی نظر اور مغربی پیمانوں کے برتنے سے یہاں کے ادب کی جو تصویر ابھری یا جو تجزئے سامنے آئے وہ یہاں کی روایات سے پوری طرح انصاف نہیں کر سکے۔ اس میں کچھ مستشرقین کی دیانتدارانہ مجبوریوں کو بھی دخل تھا اور بعض صورتوں میں شعری توجیہات کو۔

.. ——— ..

مستشرقین نے سب سے پہلے تاریخ کا جو تصور قائم کیا وہ بڑی حد تک ان کے محدود نقطۂ نظر کا پابند تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی پوری تاریخ کو دو مذہبی وحدتوں میں بانٹنے کی کوشش کی۔ پہلا دور ہندو تاریخ کا اور دوسرا مسلم تاریخ کا۔ اس گمراہ کن تقسیم کے بارے میں بجا طور پر بعد کے مورخین نے توجہ دلائی ہے۔ ڈاکٹر رومیلا تھاپر لکھتی ہیں:[۱]

"What is perhaps the most significant aspect of Mill's History of British India was that in sense it laid the foundation for a communal interpretation of Indian history and thus provided the historical justification for the two na-

tion theory. He was the first historian to develop the thesis of dividing Indian history into three periods which he called Hindu civilisation and British civilisation (Interestingly enough, not christian civilisation".

اس فرضی اور گمراہ کن تاریخی تصور کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان کے کلچر کو مختلف علاقوں کے جغرافیائی، اقتصادی اور تہذیبی عوامل کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کے بجائے مذہب کو تہذیب کی مرکزی قدر کی حیثیت دے دی گئی گویا ۱۲۰۶ء سے قبل کے ہندو حکمرانوں کے زیر نگیں ہندوستان کے ادب اور تہذیب کو ہندو مذہب کی دین قرار دے کر اس کے مخصوص کردار اور مزاج کی نشاندہی کی جانے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں تھا بلکہ اس دور میں مختلف غیر ہندو تہذیبیں بھی ابھری تھیں اور مختلف علاقائی ادبیات میں ان تہذیبوں کی گونج صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ غیر ہندو تہذیبوں اور غیر مقلد ادبیات کو مناسب اہمیت سے محروم کر دیا گیا۔

اس طرح ہندوستان کی تاریخ کا دوسرا دور مسلم ہندوستان کہا گیا اور اس دور میں اسلام کو مرکزی حیثیت دے کر تہذیب اور ادب کا رشتہ مذہب سے جوڑ دیا گیا۔ بار بار اس کا ذکر کرنا کہ مسلمان ہندوستان میں آئے یا مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے زبان اور ادبیات کا سلسلہ شروع ہوا، اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے تھا کہ مسلمان خواہ کسی بھی

ملک سے کیوں نہ آئے ہوں یا خواہ ان کا تعلق کسی بھی زبان یا ادبی روایت سے کیوں نہ ہو وہ سب کے سب مسلمان اور غیر ہندوستانی ہونے کی بنا پر یکساں تھے۔ ان کا کوئی رشتہ ہندوستان کی روایات اور تہذیبی فضا سے نہ تھا چنانچہ گریرسن لکھتے ہیں: ؎۲

"--- Urdu employed chiefly by Musalmans and by Hindus who have adopted the Musalman system of education, and a modern development, called Hindi, employed only by Hindus who have been educated on a Hindu system. Urdu, itself has two varieties, the standard literary form Delhi and Lucknow, and the Dakhini, spoken, and used as a literary medium, by Musalmans of Southern India."

پروفیسر انا ماری شمل نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر پوری مسلم ادبیات کی صف میں اردو زبان و ادب کو شامل کر کے اس کی اجتماعی خصوصیات سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے گویا اردو بھی کوئی ایسی اسلامی زبان ہے جس کی ادبیات کا رشتہ زمین اور علاقے سے نہیں، مذہب سے ہے۔ "تھری مغل پوئٹس" کے دیباچے میں وہ لکھتی ہیں: ؎۳

"Like the Turkish, Urdu poetry has inheriterd from Persian the highly developed

play on words, which can add inimitable charm by the clever use of the Arabic, Persian, and Indian elements of the poetical languages each of which bears not only its simple meaning but also different accessory notions. From this stems the peculiar art oscillation between mystical and profane meanings, or between sensuality and spirituality, which is so typical of classical Islamic poetry."

اس پوری بحث سے ایک اور غلط فہمی پیدا ہوئی اور وہ غلط فہمی یہ تھی کہ اردو زبان شاید کوئی ایسی زبان تھی جو مسلمان حکمرانوں کے حکم سے ہندوستان کے رہنے والوں پر اسی طرح لادی گئی جس طرح انگریزوں کے دور میں انگریزی۔ حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ ہندوستان میں اول تو جو مسلمان فاتح یا حکمراں کی حیثیت سے داخل ہوئے وہ سب کے سب کسی ایک ملک کے رہنے اور کسی ایک تہذیب کے ماننے والے نہ تھے۔ کوئی ترک تھا تو کوئی افغان، کوئی مغل تھا کوئی ایرانی اور جو لوگ جس علاقے کے رہنے والے تھے ان علاقوں کی تہذیبوں اور ادبی روایات کی پرچھائیاں ان کے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مستشرقین نے عام طور پر اور برطانوی

مستشرقین نے خاص طور پر ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مشترک آریائی ماضی کو نظر انداز کر دیا اور مذہب کی دیوار پر زیادہ زور دیا جو ان دونوں کے مشترکہ ماضی کو یکسر مٹا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ماضی کی اس طویل نسلی وراثت کے تسلسل کی طرف پہلی بار محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آب حیات میں اشارہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: ۴۳

"اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کئی برسوں سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ انھیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سرشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی پڑی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثری تصنیف نہیں وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ ننھےئیں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان

بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان
سمجھنے لگے تھے۔"

اور زیادہ تفصیل وشرح وبسط کے ساتھ پروفیسر محمد حسن نے اٹھارویں صدی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پسِ منظر میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ۵ے

" یہ ادبی اور لسانی انقلاب کیوں ہوا
اور اس کے تاریخی اور تہذیبی اسباب
کیا تھے؟ عام طور پر ادبی انقلاب
ذہنی اور جذباتی انقلاب کا عکس ہوتے
ہیں۔ ادبی انقلاب نئے تقاضوں کی
بنا پر ہوتے ہیں اور ان تقاضوں کی
گونج بیک وقت سیاست سے
لے کر تہذیب ومعاشرت تک سبھی
شعبوں میں سنائی دیتی ہے۔ سیاست
میں تبدیلیاں اقتصادی ڈھانچے میں
شکست وریخت سے ہوا کرتی ہیں۔
جب تک کوئی مخصوص نظام ذریعۂ
پیداوار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا
اور انھیں آگے بڑھاتا رہتا ہے اس
وقت تک وہ تاریخی ضرورت کو پورا
کرتا ہے۔ جب وہ ذرائع پیداوار

کی راہ میں رکاوٹ بن جائے اور اس
نظام کی وجہ سے سماج کا بڑا حصہ زندگی
کی عام ضروریات سے محروم ہو جائے
تو تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس
وقت ایسے طبقے وجود میں آنے لگتے ہیں
جو سماج و نظام حکومت ہی سے نہیں
بلکہ نظام اقدار سے نئے مطالبے کرتے
ہیں اور زندگی کو ایک نئے سانچے میں
ڈھالنا چاہتے ہیں۔"

آگے لکھتے ہیں: ~~۶~~ے

"۔۔۔ ایسے سرداروں کا طاقت
پکڑنا جو ایرانی النسل نہیں تھے اور جن
کی ساری قوت کا ان کے ہندوستانی
علاقوں، قبیلوں اور ان علاقوں کے
سپاہیوں پر دار و مدار تھا۔ تہذیبی اور
ادبی زندگی میں بھی تبدیلی کا پیش خیمہ
تھا۔ یہ ایرانیت کے دلدادہ ضرور
تھے مگر یہ اور ان کے حواری اور متوسلین
تہذیب اور ادبی مذاق کی جس سطح
پر تھے اس کے پیش نظر انھیں ہندوستانی
زبان و ادب میں فارسی کی چاشنی

کی تلاش تھی۔ وہ مشاعروں اور قوالیوں
میں فارسی غزلوں پر سر تو دھن لیتے تھے
مگر ان کی روحیں اس طرز کی شاعری
کو اپنی زبان سننے کے متمنی تھیں۔ فارسی
سرکاری زبان تھی۔ خواص کے لیے اب
بھی وہ ذریعۂ اظہار بنی ہوئی تھی
لیکن عوام کی ایک نئی سطح کے سیاسی
اور سماجی اہمیت اختیار کر لینے کی بنا
پر فارسی کے بجائے زیادہ عام فہم،
زیادہ بے ساختہ اور زیادہ عوامی ذریعۂ
اظہار کی ضرورت محسوس کی جانے
لگی تھی۔

۔ ۔ ۔ ریختہ نے ایک طرف ادب اور
بول چال کی زبان کی خلیج پاٹ دی
اور دوسری طرف عوام اور خواص کی
باہمی خلیج کو پُر کر دیا۔ فارسی کبھی بھی عام
بول چال کی زبان نہیں بنی۔ وہ چند
مجلسوں اور گروہوں کی زبان تھی۔
ایک حیثیت سے اس کی نوعیت وہی
تھی جو آخری دور میں سنسکرت کی ہو گئی
تھی۔ فارسی امراء اور خواص کی زبان

تھی اور ادب اور انشا کے لیے مخصوص
تھی جبکہ اردو کھڑی بولی کا ایک
مخصوص روپ "عوام کی بول چال کی
زبان بن گئی تھی۔ ریختہ نے پہلی بار
شہری عوام کے جذبۂ اظہار کو
زبان دی۔ ادبی زبان اور بول
چال کی زبان کا فرق مٹایا اور جو کام
دیہات میں بولیاں کر رہی تھیں اور
ہندی شاعری کے ذریعے سرانجام
پا رہا تھا اسے شہر کے پیمانے پر تہذیبی
ہمہ گیری اور لطافت کے ساتھ ریختہ
نے پورا کیا"۔

ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب "قومی تہذیب کا مسئلہ" میں اردو زبان
کی ابتدا اور ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"۔۔۔ اجنبیت اور مخالفت کی جو
خلیج سلطنت دہلی کے ابتدائی عہد میں
حائل تھی اسے بہت سی چیزوں نے مل
کر جن مسلمان صوفیوں اور ہندو بھگتوں
کی پیدا کی ہوئی رواداری اور محبت
کی روح بھی تھی، رفتہ رفتہ دور کر
دیا تھا اور دونوں فرقوں کے خیالات و

جذبات خصوصاً ان کے جمالیاتی شعور
میں تاثیر و تاثر کا سلسلہ شروع ہو گیا
تھا ۔ ۔ ۔ ۔ مشترک تہذیب کی جڑ
ہمیشہ ایک مشترک زبان ہوتی ہے اس لیے
کہ جب تک انسانوں کی کسی جماعت
کے پاس تبادلۂ خیال کا کوئی مشترک
وسیلہ نہ موجود ہو ان میں اتحاد خیال
اور اتفاق مذاق کا پیدا ہونا ناممکن
ہے ۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے
کے بعد دہلی کے علاقے میں مقامی بولی
اور فارسی کے میل جول سے ایک مشترک
کاروباری زبان بن گئی تھی جو آگے
چل کر اردو کہلائی ۔"

اس سے اندازہ ہو گا کہ زبانوں کی ابتدا کی جو تصویر برطانوی مستشرقین اور مورخین نے پیش کی اس کی دو نہایت گمراہ کن مضمرات تھے ۔

(الف)

یہ کہ ہندوستانی میں جو تہذیبی عمل مسلمانوں کے ہندوستان کی فتح کر لینے سے پیدا ہوا وہ بنیادی طور پر تہذیبی اختلاط اور میل جول کا عمل نہ تھا بلکہ مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کا ہندوستان کے رہنے والوں پر نافذ کرنے کا عمل تھا ۔ جس میں جبر اور ضرورت شامل تھی ۔

(ب)

اردو زبان وادب کا تعلق بنیادی طور پر مسلم حکومت اور مسلمان حکمرانوں سے تھا۔

ظاہر ہے یہ دونوں باتیں غلط تھیں اوّل تو مسلمانوں کا کوئی مذہبی تعلق اُردو کے آغاز کا سبب نہیں بنا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو مسلمان گروہ ہندوستان آئے خواہ وہ صوفیہ کی حیثیت سے آئے ہوں خواہ فاتح کی حیثیت سے وہ مختلف علاقوں کی زبانیں بولتے ہوئے آئے تھے اور ہندوستان آنے اور یہاں رہنے بسنے کے بعد یہاں کی بولیوں اور علاقائی زبانوں سے اثر قبول کر کے اپنی مادری زبانوں کو ترک کر کے یا ان کے پہلو بہ پہلو یہاں کی دیسی زبان کے اثرات سے ایک ملِواں زبان کی بنیاد پڑی اس لیے اردو کے بدیسی پہلو کے بجائے اس کے دیسی پہلو پر زور دینا زیادہ مناسب اور ضروری تھا جو مستشرقین نے نظر انداز کر دیا۔

دوسرے اردو زبان اور ادب کی ترویج واشاعت کبھی بھی مسلمان بادشاہوں کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ دکن کے بعض مشکوک اور مشتبہ روایات سے قطع نظر انیسویں صدی سے پہلے اردو کبھی بھی سرکاری زبان نہیں رہی۔ شاہ عالم ثانی کے دربار میں پہلی بار اس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی اور اس دور میں یا اس سے قبل جب کبھی بادشاہوں، امیروں اور وزیروں نے اس کی سرپرستی کی وہ دراصل اس زبان اور اس کے ادب کی عوامی مقبولیت کی وجہ سے ہوئی گویا دربار میں اسے جو اہمیت حاصل ہوئی وہ اس کی اپنی قوت اور ہر دلعزیزی کی بنا پر تھی۔

ان دونوں معروضات کے تباہ کن اثرات اردو زبان و ادب ہی کے لیے نہیں پورے ہندوستان کے زبان و ادب اور تاریخ کے لیے بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ زبان کو مذہب کے ساتھ منسلک کرکے پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان کو برطانوی مستشرقین نے اصطلاحوں سے بانٹ دیا۔

الف ــــ ہندوستانی

ب ــــ اردو

ج ــــ ہندی

ان کی بھی تقسیم اس طرح کی ہے کہ ہندوستانی وہ زبان ٹھہری جس میں بول چال کے عام الفاظ استعمال ہوں اور جس کی عام سطح کاروباری انداز سے اوپر نہ اٹھے۔ اردو وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دی گئی اور اس میں فارسی و عربی کے الفاظ کے استعمال کو اس کی خصوصیت قرار دیا گیا اور ہندی ہندوستانی کی وہ شکل قرار پائی جس میں فارسی و عربی کے الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ اور اصطلاحیں استعمال ہوں چنانچہ گریرسن لکھتا ہے: ۸؎

"When Hindustani is highly Persianised, and takes the form of Urdu, the words are often so foreign in sound that they cannot be conveniently represented in the Devanagari character. Hence Urdu is always written in Persian character.

Similarly highly Sanskritised Hindi does not lend itself to the Persian character and always appears in devanagari. Amongst fanatics who ought to know better, but do not wish to do so, this question of character has unfortunately become a sort of religions Shibboleth. True Hindustani can be written with ease in either character, and Musalmans find it easiest to read it in the persian and most Hindus in the Deva-nagari. But, owing to the fact that the extreme varieties of Hindustani on each side can only each be written in one character, these fanatics have confuse alphabet with Language."

"Sahibs and Munshis" اس تنازعے کے بارے میں کا مصنف لکھتا ہے: ۹

"However, a distinction must be made between Khariboli and Urdu. Urdu was a Persianised style of Khariboli which

developed into a sophisticated Literary dialect. But Khariboli as such was not a literary language and it was identical with Hindustani. At least that was the situation when the College of Fort William came to existence. Otherwise the question of Hindustani being in its formative stage as a literary language would not have raised at all."

اسی طرح پنڈت رام چندر شکل اپنی مشہور کتاب "ہندی ساہتیہ کا اتہاس" میں لکھتے ہیں کہ کھڑی بولی عام طور پر مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی تھی: ١٠

"देश के भिन्न भिन्न भागों में मुसलमानों के फैलने तथा दिल्ली की दरबारी शिष्टता के प्रचार के साथ ही दिल्ली की खडी बोली शिष्ट समुदाय के परस्पर व्यवहार की भाषा हो चली थी। खुसरों ने विक्रम का चौदहवी शताब्दी में ही ब्रजभाषा के साथ साथ खालिस खडी बोली में कुछ पद्य और पहेलियां बनाई थीं। औरंगजेब के समय से फारसी मिश्रित खडी बोली या रेखता में शायरी भी शुरू हो गई और उसका प्रचार फारसी पढे लिखे लोगो में बराबर बढता गया। इस प्रकार खडी बोली को लेकर उर्दू साहित्य खडा हुआ। जिसमें आगे चलकर विदेशी भाषा के शब्दो का मेल भी बराबर बढता गया और जिसका आर्दश

भी विदेशी होता गया।"

اس طرح برطانوی مستشرقین نے کھڑی بولی یا ہندوستانی کو اپنے قلم کی ایک جنبش سے دو الگ الگ زبانوں میں تقسیم کر دیا اور ان کے درمیان مخاصمت اور مقابلے کی ایک دیوار قائم کر دی گئی۔ اس کے پہلو بہ پہلو ان کے لیے دو الگ الگ رسم خط کی تلاش بھی شروع ہوئی۔ اور یہ رسم خط ایک دوسرے کے مخالف بنا کر پیش کیے گئے۔ ہندی دیوناگری کو ہندوؤں کے لیے لنگوا فرینکا Lingua Franca for the Hindus قرار دینے کی کوشش ہونے لگی اور اس طرح جدید ہندوستان کے فن پر ایک ایسا زبردست لسانی قضیہ شروع ہوا جو ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند و پاک کے بعد بھی ختم ہونے میں نہیں آیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پوری دُنیا کی تاریخ میں یہ ایک انوکھی مثال ہے جب دو زبانیں ایک ہی نحوی ڈھانچے سے ابھری ہوں اور دو الگ الگ رسم خط میں لکھی جاتی ہوں اور محض چند ایسے الفاظ اور اصطلاحوں کی وجہ سے جداگانہ بلکہ ایک دوسرے کی حریف سمجھی جائیں جو وہ بعض قدیم یا غیر ملکی زبانوں سے مستعار لیتی ہیں۔ زبانوں کی پہچان الفاظ اور اصطلاحیں نہیں ہوتے بلکہ ان کی نحوی بنیادیں ہوتی ہیں۔ مگر ان دونوں زبانوں کے بارے میں یہ عام اصول بھی فراموش کر دیا گیا ہے اور ان کے درمیان نفرت کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

اس کی سب سے دلچسپ مثال بھارتیندو ہرش چندر کے زمانے میں کھڑی بولی کے اسلوب کے سلسلے میں راجہ شیو پرشاد ستارہ ہند اور راجہ لکھمی پرشاد کی بحث سے ملتی ہے۔ پنڈت رام چندر شکل کے

الفاظ میں :۔ [۱۱]

"सरकार की कृपा से खड़ीबोली की अरबी-फारसीमय रूप लिखने पढने की अदालती भाषा हो कर सबके सामने आ गया। जीविका और मान मर्यादा की द्रृष्ठि से उर्दू सीखना आवश्यक हो गया। देश भाषा के नाम पर लडको को उर्दू सिखाई जाने लगी। हिन्दी की काव्य परम्परा यद्यपि राजदरबारों के आश्रय में चलती थी पर उसके पढने वालों की संख्या भी घटती जा रही थी। --- इस स्थिति का वर्णन करते हुए स्वर्गीय बाल मुकुन्द गुप्त लिखते है :

जो लोग नागरी अक्षर सीखते थे, फारसी अक्षर सीखने पर विवश हुए और हिन्दी भाषा हिन्दी न रह कर उर्दू बन गई--- हिन्दी उस भाषा का नाम रहा जो टूटी फूटी चाल पर देवनागरी अक्षरों में लिखी जाती थी।"

یعنی وہ تمام تحریریں جن میں عربی فارسی الفاظ نکال دیے جائیں تو ایک دوسری زبان کی تحریریں کہلاتیں اس کا ایک مضحکہ خیز حد تک عجیب پہلو یہ تھا کہ مشہور اردو شاعر انشاء اللہ خاں انشاء "رانی کیتکی کی کہانی" کو محض اس وجہ سے ہندی کا پہلا ناول کہا جانے لگا کہ اس میں مصنف نے جان بوجھ کر عربی فارسی کے الفاظ استعمال نہیں کیے یا بہت کم کیے ہیں حالانکہ شاعر انشاء کا ہندی ادب کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ اردو کے خلاف یہ تعصب پھیلایا گیا کہ مسلمان حکمرانوں کی عائد کی ہوئی زبان ہے اور اس کا ادب نوابی ادب

ہے یا اس کا تعلق درباروں سے ہے۔ برطانوی مستشرقین نے اس رویے کو پھیلانے میں بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر خاصہ اہم حصہ لیا۔ چنانچہ یہ خیال کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں فارسی اور اس کے بعد اردو کو رائج کیا اور اس ادب کو ہر علاقے میں پھیلانے کی ذمہ داری مسلمان حکمرانوں کی ہے۔ جا بجا مستشرقین کے لکھے ہوئے تاریخ ادب کے مضامین میں جھلکتی ہے مثلاً رالف رسل اپنی کتاب کا نام "مغل پوئٹس" Mughal Poets رکھتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ اور سوداؔ دونوں میں سے کوئی بھی مغل دربار سے متعلق نہ تھا اور دونوں منتقل ہو کر دہلی سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہاں بھی باقاعدہ دربار سے منسلک نہ تھے۔ تیسرے شاعر میر حسن کی نوعیت ان دونوں سے زیادہ آزادانہ تھی اور وہ مغل دربار سے کسی حیثیت سے بھی وابستہ نہ تھے بلکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ فیض آباد میں گذرا اور اودھ میں مغل دربار نہ تھا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وہ تمام ادبی اصناف جو درباروں کے باہر نشو و نما پاتی رہیں اور ایسے شاعر اور ادیب جو ان دائروں سے الگ تھلگ رہے، تاریخ ادب میں یا تو سرے سے جگہ ہی نہ پا سکے یا پھر مناسب اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ ان میں شاید سب سے اہم نام نظیر اکبر آبادی کا ہے اور ایسے لاتعداد شاعروں کے نام ہیں جو گمنام رہے مگر ان کی فکر و فن سے عوامی ادب کی پرورش ہوئی اور اردو کے ادبی سرچشمے سرسبز ہوئے۔ عوامی سطح پر میل جول اور تہذیبی اختلاط کے اس عمل کو اور اس عمل کے تاریخی تسلسل کو مستشرقین نے نظر انداز کر دیا۔

چنانچہ اردو ادب شرفا کے ایک ایسے ادب کی طرح پیش کیا گیا جس کی

جڑیں زمین میں نہ تھیں اور جس کی علاقائی وفاداریاں مشتبہ تھیں۔ اس بنا پر اردو کے عوامی رشتوں کو سرے سے اہمیت نہیں دی گئی جس کی بنا پر بعد کو آنے والے ہندوستانی مورخین کی نظر سے بھی یہ پہلو بڑی حد تک اوجھل رہا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادبی تاریخ کا باقاعدہ تصوّر پہلی بار اردو میں انگریزی مستشرقین کی کوششوں سے آیا اس قبل تذکروں کی روایت عام تھی اور تذکروں کی تقسیم، تدوین عام طور پر یا تو حروف تہجی کے اعتبار سے کی جاتی تھی یا پھر ابجد ہوّز کے اعتبار سے۔ اور عام طور پر ان کا کارنامہ مختلف شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب، اور ان شاعروں کے بارے میں سکّہ بند اور خاصے مبالغہ آمیز الفاظ میں اظہارِ خیال تک محدود رہتا تھا۔ ان میں البتہ ایسے تذکرے بھی شروع ہی سے تھے جن میں ادوار سے تعین کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ تعین تین ادوار کی شکل میں کیا گیا۔

دورِ متقدمین

دورِ متوسطین

دورِ متاخرین

ظاہر ہے کہ یہ ادوار مختلف تذکروں کے لکھے جانے کے وقت مختلف ہوتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی تقسیم کسی نہ کسی حد تک ضرور تاریخی کہی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان مختلف ادوار کے لکھنے والوں

کی مشترک ادبی خصوصیات کی نشان دہی کی جائے مثلاً متقدمین کو ابہام گوئی کا دور کہا گیا۔ لیکن اس قسم کی کوشش کم ہے اور ان کا دائرہ کار خاصہ محدود ہے۔ مستشرقین کی تصانیف اور ان کے زیرِ اثر لکھی جانے والی کتابوں میں البتہ تاریخ کا زیادہ بہتر شعور ملتا ہے۔

اس کے باوجود برطانوی اور مغربی مستشرقین کی اس مجبوری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اردو ادب کی اصناف کی روح اور ان کے روایتی ماخذ کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے۔ یہ کوتاہی بڑی حد تک ان کے مختلف انداز نظر اور مختلف معیاروں کی وجہ سے ہوئی۔ مثلاً اردو ادب میں مغربی اثرات کے عمل دخل سے پہلے ایسی متعدد اصناف موجود تھیں جنھیں کسی مغربی صنف کے معیار پر جانچنے پرکھنے کے بعد اس کی ناقص شکل قرار دیا گیا اور اسی بنا پر اس کی تراش خراش ضروری سمجھی گئی مثلاً قصے اور داستانیں ناول کا ناقص ادب قرار دی گئیں اور غالباً اسی بنا پر برطانوی اور مغربی مستشرقین کی لکھی ہوئی تاریخِ ادب، قصے اور داستانوں کے ذکر سے سرے سے خالی ہیں یا ان کا ذکر بہت کم اور بہت ناقص طریقے پر کیا گیا ہے۔ مثلاً گراہم بیلی کے یہاں ضمنی طور پر اردو نثر کا ذکر ملتا ہے جس میں مختلف نثر نگاروں کا سرسری ذکر کیا گیا ہے اور نثر کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اس میں فکر، معتبر اور صحت مند تاریخ اور اچھی تنقید کا فقدان ہے: [۱۲]

"In prose we miss philosophy, impartial history and penetrating criticism. These are works on historical subjects, but generally speaking they show a lack of

genuine research and unprejudiced invest-
igation. Criticism lends to confine it-
self to questions of verbal cleverness
and Linguistic correctness."

اس طرح مجموعی اعتبار سے بیلی کی تاریخ ادب اردو، اردو ادب کی تاریخ نہ رہ کر اردو کے شعری سرمائے کی تاریخ بن کر رہ گئی ہے۔

اسی طرح غزل کو مغرب کی غنائی شاعری Lyrical poetry کے پیمانے میں ڈھالا گیا اور غزل کے خلاف اکثر فیصلے جو بعد میں صادر کیے گئے دراصل مستشرقین کے غزل کو مغربی معیاروں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی بنا پر ہوئے۔

غزل کے ضمن میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ غزل میں عشق و عاشقی کے تذکرے اور معاملات حسن و عشق اس کی علامتوں اور رمزیات کو جوں کا توں لغوی معنوں میں سمجھنے کی غلطی دور حاضر تک برطانوی مستشرقین نے کی ہے مثلاً رالف رسل غزل میں مذکر فعل کے استعمال سے دھوکا کھاتے ہیں اور امرد پرستی کے سلسلے میں ایک طویل نوٹ لکھنا ضروری خیال کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غزل میں مذکر فعل کا استعمال لازمی طور پر امرد پرستی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ مسعود حسن رضوی ادیب نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ: [۱۳]

" اردو شاعری کا جو حصہ اعتراض کی
آنکھوں میں کھٹکتا ہے وہ ہے جو عشق و
محبت سے تعلق رکھتا ہے۔ جذبات عشق
میں ایشیا اور یورپ میں مشرق و مغرب

کا فرق ہے۔ جن لوگوں نے صرف انگریزی
صناعوں کی بنائی ہوئی محبّت کی تصویریں
دیکھی ہیں وہ ہمارے مصوروں کے کمال
کی داد کیا دے سکتے ہیں؟ عشقیہ شاعری
کا تعلق جہاں تک ہے انگریزی اور
اردو شاعری میں جسم و جان کا فرق
ہے۔ انگریزی شاعروں نے اگر پیکر محبّت
کے مجسمے بنائے ہیں تو ہمارے شاعروں
نے روح محبّت کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔
"۔۔۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں
معشوق جنس ذکور سے ہوتا ہے اور
امرد پرستی کے جذبات نظم کیے جاتے۔
اس لیے وہ خلاف فطرت بھی ہیں اور
مخرب اخلاق بھی۔ اگر یہ اعتراض کرنے
والے ذرا آنکھ کھول کر اردو شاعری
کے وسیع میدان کی سیر کریں تو حقیقت
خود بول اٹھے گی کہ اس اعتراض
کی بنا وہم یا ناواقفیت پر ہے! اردو
غزلوں میں ہزارہا شعرا ایسے ملتے ہیں
جن میں معشوق کی نسوانیت بے پردہ
نظر آتی ہے"۔

وہ آگے لکھتے ہیں : ۱۴ے

"اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب معشوق جنس اناث سے ہوتا ہے تو مردانہ لباس میں کیوں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری تہذیب عورتوں کا ذکر کرنا اور نام لینا تک شرم وحیا کے خلاف سمجھتی ہے۔ ان کے حسن وجمال کا کھلم کھلا بیان کرنا اور ان سے اعلانیہ عشق ومحبت کا اظہار کرنا تو اتنا بڑا گناہ ہے کہ رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں۔"

اسی طرح ڈیوڈ میتھیوز اور شکل اپنی کتاب

An Anthology of Classical Urdu love Lyrics

میں عشق کی ان تہہ در تہہ معنویت کو نہیں سمجھ پاتے جو اردو غزل کو نئی جامعیت اور تہہ داری بخشتی ہے اور اسے بلیغ اشاروں کا ایک حیرت انگیز مرقع بنا دیتی ہے۔

یہی حال مثنوی کا ہے جسے مسلسل نظم کا بدل نہیں سمجھا گیا اور اس کی مخصوص بحر اور بعض دوسرے التزامات کی بنا پر اسے نظم مسلسل کا درجہ نہ ملا۔

غرض برطانوی مستشرقین کے جائزے نے اردو ادب کی ان بنیادی اقدار پر غور نہیں کیا جو اسے مشرق کے مزاج سخن سے ملی ہیں۔ اردو ہندوستان

میں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی اس لیے اس پر مشرقی مزاج کی گہری چھاپ ہونا قدرتی بات ہے۔

مشرقی مزاج لازمی طور پر کسی قدر تہہ داری، رمزیت اور اختصار کو پسند کرتا ہے۔ وہ مسلسل پرواز کا متحمل نہیں ہو پاتا بلکہ اشاروں اشاروں میں تہہ در تہہ معنویت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی آگاہیاں عرفان کائنات کی نئی مہم نہیں ہوتیں بلکہ مانوس سچائیوں کا ایک ذخیرہ ہوتی ہیں جو نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہتی ہیں اس لیے مشرق کے نزدیک آگاہی، انفرادی دریافت نہیں جتنی اجتماعی آہنگ ہے اور اس آہنگ کے رموز و علایم افسانوی افسوں سبھی متعین سے ہیں اور ان مسلمہ و متعین سانچوں میں رہ کر بھی متنوع جذبات و احساسات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ برطانوی اور مغربی مستشرقین علامتوں کے اس تہہ در تہہ اور بلیغ مرقعوں میں پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور اردو کے اصناف سخن پر ان کے تنقیدی محاکمے یا تو خوش اخلاقی اور مروت کے باعث ہیں یا پھر ان کے اپنے ذوقِ سلیم کی کمی پر دلالت کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اردو ادب کو برطانوی مستشرقین نے مشرقی روایات کا حصّہ اور ہندوستانی مزاج کا آئینہ دار سمجھ کر پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کا رشتہ یا تو مذہب سے ملا دیا یا پھر اسے محض حکمرانوں کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ایک درآمد کیے ہوئے تمدن یا ادب سے ملایا جس کی وجہ وہ اردو ادب کے مشرقی تشخص کو نہیں سمجھ سکے اس بنا پر ان کے یہاں تنقیدی درجہ بندی کی کمی بھی جا بجا جھلکتی ہے۔

بہر حال اگر برطانوی مستشرقین کے کارناموں اور کمزوریوں کا میزانیہ تیار کیا جائے تو ان کی بعض خدمات کا یقیناً اعتراف کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی پیدا کردہ ان غلط فہمیوں کی بھی نشاندہی کرنی ہوگی جن کی بنا پر آگے چل کر تہذیبی اور ادبی گمراہیاں پھیلیں۔

جہاں تک خدمات کا تعلق ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ برطانوی مستشرقین نے پہلی بار بکھری ہوئی ادبی یادداشتوں اور بیاضوں کو مربوط ادبی تاریخ کا تسلسل بخشا اور اسے تاریخی شعور اور تسلسل کے ساتھ تاریخ ادب کی شکل میں مرتب کیا۔ تذکروں سے تاریخِ ادب تک لانے کا سہرا یقیناً برطانوی مستشرقین کے سر ہے۔

اس عمل کے دوران انھوں نے صرف شاعری ہی کو ادب نہیں سمجھا بلکہ تمام قدیم تر ادبی تذکروں کے برخلاف نثر کو بھی اہمیت دی اور نثر و نظم دونوں کو ملا کر ایک مکمل ادبی تصویر تیار کرنے کی کوشش کی۔ یہ صحیح ہے کہ نثر کا ذکر کم رہا اور اس کو وہ اہمیت بھی نہیں حاصل ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ برطانوی مستشرقین اس تحقیق کے نہ عادی تھے نہ ایسے وسائل رکھتے تھے جو نثر کے ابتدائی نمونوں کو ڈھونڈھ نکالنے اور ان کا مربوط اور معروضی تنقیدی محاکمہ کرنے کے لیے ضروری تھے۔ ان کا مقصد تو محض عام قاری کے لیے ایک رواں اور دلچسپ تاریخی بیان فراہم کرنا تھا جس سے اسے اردو ادب کے عام رجحان کا اندازہ ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود نثر کو اہم ادبی صنف کی حیثیت سے تاریخ ادب میں جگہ دینے کے سلسلے میں ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً بیلی نے تاریخ لکھتے وقت تذکروں کو بنیاد بنایا جن کے غیر معتبر ہونے

کا اس نے خود بھی اعتراف کیا: [۱۵]

"Information about the early Urdu poets is ultimately derived from old Persian anthologies, the great majority of which are unpublished.

---There is considerable doubt about dates particularly the earlier ones. The anthologies frequently omit dates, and often differ in the dates they give."

اسی طرح رسل کی تصانیف ہیں جن کا مقصد غیر اردو داں طبقے کو اردو سے روشناس کرانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: [۱۶]

"It is an attempt which so far as we know has not been made before, to introduce to the English speaking reader the work of three great poets of one of the major modern languages of the Indian-subcontinent namely Urdu."

تیسری اہم خدمت انھوں نے یہ انجام دی کہ اردو ادب کو ایک غیر ملکی ہونے کے ناتے معروضی نظر سے دیکھا۔ ظاہر ہے ان کا معیار مختلف تھا اور وہ مغرب کے ادبی ذوق کے پروردہ تھے لیکن ان تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو اس قسم کے حالات میں ناگزیر ہیں انھوں نے کسی نہ کسی حد تک اردو ادب

کی تاریخ کو عالمی معیاروں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہمارے ادب کو وہ شناخت تو فراہم نہ کرسکے جو اس کا حق تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کی کوششوں سے اردو ادب کو خود اپنی تصویر دیکھنے کو ملی اس کے ساتھ ایک وسیع تر حلقے سے معترف ہونے کا موقع ملا۔

مگر ان خدمات کے باوجود برطانوی مستشرقین کے افکار و اعمال بنیادی طور پر ان کے تصوّر تاریخ سے متعین ہوئے تھے اور اس تصوّر کو تاریخ میں ان کے سیاسی منصب اور موقف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے مختلف ادوار میں ان کی علمی نقاط نظر پر بھی ان سیاسی مصلحتوں کا سایہ صاف نظر آتا ہے۔ گریرسن نے یقیناً ہندوستان کی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ مرتب کرکے ایک تاریخ ساز خدمت انجام دی مگر یہ جائزہ بھی اس قسم کی مصلحتوں اور کمزوریوں سے یکسر خالی نہیں ہے۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو بھی اردو داں یا ہندی داں نظر انداز نہیں کرسکتا مگر یہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ہندی نزاع کو موجودہ شکل دینے کی بڑی ذمہ داری فورٹ ولیم ہی کے سر ہے یا کم سے کم اس نزاع کا نقطۂ آغاز فورٹ ولیم ہی نے فراہم کیا۔

ان سب کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مستشرقین کی تاریخ نویسی، دراصل کلچر کی بدحالی Acculturation اور متغائرا اور مختلف مزاج تہذیبوں کے نقطۂ نظر کی آمیزش کی دلچسپ اور معنی خیز مثال فراہم کرتی ہے اور تقابلی ادب کے لیے مطالعے کا ایک اہم موضوع ہے۔ ڈیوڈ کاف کے الفاظ میں: ۱۷؎

"The representatives of the British nation

in India who were largely responsible for these positive aspects of Westernisation and Modernisation were a group of "acculturated" civil, military, and judicial officials (and some missionaries) who are identified as Orientalists ---In 1954, at the Social Science Research Council Summer Seminar on Acculturation, the process was broadly defined as culture change that is initiated by the conjunction of two or more autonomous culture system."

اردو ادب اور تاریخ ادب نے ان کوششوں اور کاوشوں سے بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا۔ مگر اس کے باوجود برطانوی اور مغربی مستشرقین کی کوششیں اپنے کارناموں اور کمزوریوں کے باوجود اردو ادب کے مطالعے اور اس کی تاریخ نویسی کے طریقۂ کار کے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔

حواشی و حوالے

ح ۱ Romila Thapar:

communalism and the writing of Indian History" Page: 4

(People's Publishing House, New Delhi-1981)

ح ۱ "مل نے برطانوی ہندوستان کی جو تاریخ لکھی ہے اس کا غالباً سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ اس کے ساتھ ہندوستانی تاریخ کی فرقہ وارانہ تعبیر کی داغ بیل پڑی اور اس طرح دو قومی نظریے کے لیے مل نے تاریخی جواز فراہم کیا۔ وہ پہلا ایسا مورخ ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ کے سہ ادواری تقسیم کے نظریے کو فروغ دیا جسے اس نے ہندو تہذیب، مسلم تہذیب اور برطانوی تہذیب کا نام دیا۔ (مزے کی بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلم تہذیبوں کی طرح اس نے عیسائی تہذیب کا نام نہ لے کر تیسرے دور کو برطانوی تہذیب کا نام دیا) ۔"

ح ۲ G.A.Grierson:

"Linguistic Survey of India, Vol.IX,Pt.I"
Page: 1

(Motilal Banarsidass, Delhi)

۲ے اردو کو خاص طور پر مسلمانوں نے اور ان ہندوؤں نے اپنایا جنھوں نے تعلیم کے مسلم نظام کو قبول کر لیا تھا اور نسبتاً جدید روپ جسے ہندی کہتے ہیں وہ صرف ان ہندوؤں نے اپنایا جنھوں نے ہندو نظام کے تحت تعلیم پائی تھی۔ خود اُردو کی دو شکلیں ہیں معیاری ادبی روپ جس نے دلّی اور لکھنؤ میں فروغ پایا اور دکنی روپ جسے جنوبی ہند کے مسلمان بولتے ہیں اور ادبی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

۳ے Ralf Russsel

Three Mughal Poets Page: IX

(George Allen and Unwin, Ltd. London, 1969)

۴ے "ترکی کی طرح اردو شاعری کو بھی لفظوں سے کھیلنے کا انتہائی ترقی یافتہ ہنر فارسی سے ورثے میں ملا ہے جس میں شعری زبانوں کی طرح فارسی اور ہندوستانی عناصر کے چابکدستی کے ساتھ استعمال نے مزید جاذبیت پیدا کر دی ہے اور جس میں ہر ایک کی دنیا اپنے لغوی معنوں تک محدود نہیں بلکہ محل استعمال کی وجہ سے نت نئے گوشے پیدا ہو جاتے ہیں اسی خصوصیت نے اس مخصوص فن کو جنم دیا جسے ہم صوفیانہ اور دنیوی مفاہیم کے درمیان یا حسیت اور روحانیت کے درمیان گردش کرنے کا مخصوص فن کہتے ہیں جس سے کلاسیکی اسلامی شاعری کا دامن مالا مال نظر آتا ہے۔"

محمد حسین آزاد

"آبِ حیات" : صفحہ ۲۰
(رام نرائن بینی مادھو پبلشر و بک سیلر الٰہ آباد ۱۹۶۲ء)

پروفیسر محمد حسن : ۵؎

"دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پسِ منظر صفحہ : ۱۸۱
(۱۷۰۷ء سے ۱۸۱۵ء تک)
ادارۂ تصنیف ۔ علی گڑھ ۔ ۱۹۶۴ء

ایضاً صفحہ ۔ ۴۴ ۶؎

ڈاکٹر عابد حسین ۷؎

"قومی تہذیب کا مسئلہ" صفحہ ۱۳۱
انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۵ء

۸؎ G.A.Grierson:

Linguistic Survey of India - Vol. IX Pt.I

Page: 49

"جب ہندوستانی زبان میں فارسی کی بہت زیادہ آمیزش کر دی جاتی ہے اور وہ اردو کا روپ لے لیتی ہے تو اکثر الفاظ کی آوازیں اس حد تک غیر ملکی ہو جاتی ہیں کہ انہیں دیوناگری رسم الخط میں آسانی کے ساتھ پکڑا نہیں جا سکتا ۔ اسی لیے اردو ہمیشہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ۔ اسی طرح سے سنسکرت زدہ ہندی فارسی رسم الخط کی پکڑ میں نہیں آتی ۔ اسی لئے ہمیشہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے متعصب لوگوں کو اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے مگر وہ اس فرق کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں ، رسم الخط کا یہ

سوال بد قسمتی سے ایک طرح کی مذہبی کشمکش کا روپ اختیار کر گیا ہے۔ ہندوستانی دونوں ہی رسم الخط میں آسانی کے ساتھ لکھی جا سکتی ہے لیکن مسلمانوں کو اس کے لیے فارسی رسم الخط استعمال کرنے میں سب سے زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے جبکہ بیشتر ہندو دیوناگری رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی کی دونوں انتہا پسندانہ شکلیں دونوں فریقین کی نظر میں صرف کسی ایک رسم الخط میں ہی لکھی جا سکتی ہیں، اس طرح یہ متعصب لوگ زبان کا درجہ رسم الخط کو دے بیٹھے ہیں۔"

۹ے Sisir Kumar Das

"Sahibs and Munshis" Page-45

(Orion Publications Pvt.Ltd., N. Delhi-1978)

"لیکن کھڑی بولی اور اردو میں بہر حال فرق کیا جانا چاہیے۔ اردو کھڑی بولی کا ایک فارسی زدہ روپ ہے جس نے ایک شستہ ادبی بولی کے طور پر فروغ حاصل کیا لیکن کھڑی بولی اپنے طور پر کوئی ادبی زبان نہیں تھی بلکہ اس سے مراد لگ بھگ وہی زبان تھی جسے ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ کم از کم جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو یہی صورتِ حال تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ ہندوستانی اپنے تشکیل کے مرحلے پر کوئی ادبی زبان تھی۔"

۱۰ے

۱۱؎
शुक्ल, आचार्य राम चंद्र : हिन्दी साहित्य का इतिहास

۱۲؎ T.Grahame Bailey

"A History of Urdu Literature" Page-102.

(Sumit Publications, Delhi- 1979.)

"نثر میں ہمیں فلسفہ، غیر جانبدارانہ تاریخ اور باا ثر تنقید کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ تاریخی موضوعات پر کچھ تصانیف ملتی ہیں لیکن عام طور پر ان میں حقیقی تحقیق و جستجو اور غیر جانبدارانہ چھان بین کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ تنقید کا دائرہ بھی لفظی چابکدستی اور لسانی صحت جیسے سوالات تک محدود ہے۔"

۱۳؎ مسعود حسن رضوی ادیب

"ہماری شاعری" صفحہ ۱۰۳-۱۰۵

(نول کشور۔ لکھنؤ۔ ۱۹۴۴ء)

۱۴؎ ایضاً صفحہ ۱۰۹

۱۵؎ T.Grahame Bailey

A History of Urdu Literature Page-1

"ابتدائی دور کے اردو شعراء کے بارے میں معلومات کا ذریعہ پرانے فارسی تذکرے ہیں جن کی بڑی تعداد ابھی تک قلمی نسخوں کی ہی شکل میں ہے۔ تاریخیں، خاص طور پر ابتدائی دور کی تاریخیں، خاصی حد تک مشتبہ محسوس ہوتی ہیں۔ تذکروں میں عام طور پر تاریخوں کا اندراج نہیں ہے اور اکثر تاریخوں کے معاملے میں ان میں بڑا فرق نظر

آتا ہے۔"

۱۶؎ Ralph Russel

Three Mughal Poets Page- XV

" یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کا مقصد انگریزی جاننے والوں تک برصغیر ہندوستان کی ایک بڑی جدید زبان یعنی اردو کے تین عظیم شاعروں کی تخلیقات سے روشناس کرانا ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کام پہلے نہیں کیا گیا۔"

۱۷؎ David Kopf

British Orientalism and Bengal Renaissance
Page-4

(Firma K.L. Mukhopadhyay-Calcutta-1969)

ہندوستان میں برطانوی قوم کے جو نمائندے مغربی تمدن کے رواج اور جدید ذہن کی نشو و نما کے ان مثبت پہلوؤں سے کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں وہ "غیر متمدن" شہری، فوجی اور عدلیہ سے تعلق رکھنے والے افسران (اور کچھ مشنری) کے ایک گروہ پر مشتمل تھے جن کو ہم مستشرقین قرار دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۵۴ء سماجی علوم کی تحقیقی کونسل کے گرمیوں کے سیمینار میں، جس کا موضوع کلچر کی خستہ حالی تھا، اس عمل کو وسیع معنوں میں کلچر کی تبدیلی قرار دیا گیا جو دو یا اس سے زائد منفرد تہذیبوں کے اختلاط سے شروع ہوتی ہے۔

کتابیات

1. Arberry, A.J., British Orientalists
William Collins - London - 1943.
2. Arberry, A.J. Asiatic Jones
British Council Publications, London - 1944.
3. Bailey T.G., A History of Urdu literature
Sumit Publications,, Delhi - 1979
4. Brelvi Ebadat, Poems of John Gilchrist
University Oriental College, Lahore-1977.
5. Chatterjee, Atul and Bura Richard
Btitish Contribution to Indian Studies
Longmans Green and Co. London-1943
6. Carr, E.H., What is History
Penguin Books - 1976.
7. Das, Sisir Kumar, Sahibs and Munshis
Orion Publications, Pvt.Ltd., New Delhi-1978.

8. Ghoshal, A.K., Civil Services in India

(Under East India Company)

---Calcutta University, 1944

9. Garratt, G.T., Legacy of India

Oxford University Press - 1967

10. Grierson,G.A., Linguistic Survey of India

Motilal Banarsidass, Delhi

11. Holborn, Hajo, History and Humanities

Doubleday and Company, New York, 1972.

12. Kopf, David, British Orientalism and Bengal Renaissance

Firma K.L. Mukhopadhyay, Calcutta 1969

13. Kidwai, S.R. Gilchrist and the Language of Hi-ndustan

Rachna Prakashan, New Delhi-1972.

14. Latif, S.A.,The influence of English literature on Urdu Literature.

Forster Groam and Co. Ltd., London-1924.

15. Meinecke, F., Historicism

Rontledge and Kegan Paul, London-1972.

16. Pearson,J.D., Oriental and Asian Bibliography

Crosby Lockwood & Son Ltd, London 1966.

17. Russell Ralph, Three Mughal Poets

George Allen & Unwin, London- 1969.

18. Russell, Ralph, Ghalib-Life and Letters

George Allen & Unwin, London- 1969.

19. Russell, Ralph, Ghalib: the Poet and His Age

George Allen & Unwin, London 1972.

20. Strauss, Claude Lev, Structural Anthropology

Basic Books Publishers, London 1963.

21. Said, Edward W., Orientalism

Rontledge and Kegan Paul Ltd. London 1978.

22. Siddiqi, M.Atique, Origins of Modern

Hindustani Literature

Naya Kitab Ghar - Aligarh-1963.

23. Thapar, Romila, Communalism and the writing

of Indian History

Peoples' Publishing House, Delhi 1981.

24. Wellek, Rene and Warren Austin

Theory of Literature

Pengium Books, 1976.

25 Wellek, Rene, Discrimin tions

Vikas Publications, Delhi-1970

Books consulted in India Office Library, London:

1. Arberry, A.J., Oriental Essay: Portraits of Seven Scholors, London, 1960.

2. Alger, W.R., The Poetry of the East-London-1856.

3. Baillie, A.F. The Oriental Club and Hanover Square - London- 1901

4. Boyd, A., Guide to Fourteen Asiatic Languages London-1947

5. Boardman, E.P., Asian Studies in Liberal Education - Washington - 1959.

6. Chatterji, S.K., and Chaudhari, S. International Congress of Orientalists 26th Congress, New Delhi - 1964 - Vol.I

7. Ceadel, E.B., Literatures of the East: An Appreciation London - 1953.

8. De.Bary, W.T. and Embree, A.T. A guide to Oriental Classics - New York, 1964.

9. Dandekar, R.N. and Raghavan, V. Oriental Studies in India- New Delhi-1964.

10. De Bary, W.T., and Embree, A.T. Approaches to Asian civilisation, New York 1964.

11. De Bary, W.T., Approaches to Oriental Classics
New York-1959.

12. Forrest, D., The Oriental: Life story of a Westend Club. London - 1968.

13. Gafurov, speech at International congress of Orientalists in New Delhi -1964.

14. Gibb, H.A.R., Area Studies Reconsidered
London - 1963

15. Ghosal, U.N, Progress of Greater Indian Research
Calcutta-1943.

16. Gilchrist, J.B., Hindoostanee and English Dictionary _ Calcutta - 1786-90

17. Gilchrist, J.B. Grammar of Hindoostanee Language- Calcutta-1796.

18. Gilchrist, J.B., Oriental Linguist
Calcutta-1798

19. Gilchrist, J.B., Appendix (to Grammar and Dictionary) Calcutta-1798.

20. Gilchrist, J.B., Hindoostanee Philology
Edinburgh-1810

21. Gilchrist, J.B., A New Theory of Persian verbs
Calcutta 1801

22. Gilchrist, J.B., Oriental Fabulist-
Calcutta-1803

23. Grierson, G.A., Modern Vernacular Literature of Hindustan Calcutta-1817.

24. Hunter, W.W., A comparative Dictionary of the Languages of India and High Asia
London - 1868.

25. Hadley, Capt.George,Grammatical Remarks on the Practical and Vulgar Dialect of Indostan
London-1772.

26. Hosking, R.F. and Meredith Owens, G..M.
A Handbook of Asian Scripts
London- 1966.

27. Jarrett, H.S., A mannual of reference to the examinations in oriental Languages held throughout the Bengal Presidency
Calcutta-1875.

28. James, H.R., Education and Statesmanship in India— London - 1911.

29. Kabir, Humayun, International Congress of Ori entalists, New Delhi - 1964 Vol.II

30. Keay, F.E., A History of Hindi Literature London-1933.

31. Lehmann, Fritz, Urdu Literature and Mughal Decline — Michigan - 1970

32. Lang, D.M., A Guide to Eastern Literatures -London 1971.

33. Morris, H.Literation and transtiteration: Suggestions and notes. London - 1901.

34. Martin, R.M. Welleslay's Minutes and Dispatches-3 Vols. London- 1836

35. Max Mullar, F. Sacred books of the East (in 50 vols) Oxford- 1879-1910

36. Max-Mullar, F. Bibliographical Essays London -1884

37. Mahmood, Syed, A History of Education in India 1781-1893 -Aligarh-1895.

38. Prusek, Jaroslov, Dictionary of Oriental Lit eratures London-1974.

39. Philips, C.H. Handbook of Oriental Hisitory London- 1951.

40. Pearce, R.R., Memories and Correspondence of

Richard Marquess Welleslay- London 1846.

41. Roy, D., Grammar Calcutta-1854

42. Ross, E.D., Eastern Art and Literatutre London-1928

43. Ranking, Lieut,Col.G.S.A., History of the College of Fort William, Calcutta.

44. Roebnek, Thomas, Annals of the College of Fort William - Calcutta 1819

45. Shah, Ikbal Ali Sirdar, The Oriental Carvan London-1933.

46. Singh, Puran, The spirit of Oriental Poetry Punjab-1969.

47. Satthianadhan,S., History of Education in Madras Presidency Madras-1894.

48. Trevelyan, C.E., on the Education of the People of India, Lonaon-1838.

49. Thomas, F.W.,Presidential Address at All India Oriental Conference, 1937 - Trivandrum.

50. Tietjens, Poetry of the Orient London 1928

51. Welllesley, Richard Marqins,The Annals of the College of Fort William - Calcutta-1819.

52. Wheeler, S., The Annals of the Oriental Club -1842-1858 London-1925

53. Woodrow, H., Macanlay's Minutes on Education in India London-1862

54. Yates, W., Transliteration London - 1858

55. Yule and Buruell, Hobson Jobson (a glossary of colloquial Anglo- Indian words and phrases). London-1903.

RECORDS & REPORTS:

1. **Bureau of Education, India**

   Selections from educational Records, Part-I- (1781-1839)

   Edited by H.Sharp

   Published at Calcutta by the Superintendent, Govt.Printing, India - 1920.

2. Selections from Educational Records, Part-II (1840-1859)

   Edited by J.A.Rechey

   Published at Calcutta by the Superintendent

Govt.Printing, India - 1922

3. Selections from educational Records of the Govt of India- Development of University Education (1860-1887)

Edited by J.P.Naik

Published for the National Archives of India by the Manager of Publications, Govt of India, Delhi-1963.

4. Proceedings, Home, Public, 1799 (India Office Library, London)

5. Public Dispatches, Home, Public, 1830 (National Archives of India, Delhi)

6. Proceedings, Home, Public, 1834. (India Office Library, London)

7. Macanlay Minute (India Office Library, Bondon)

8. Resolution, Home, Public, 7th March, 1835 (India Office Library, London)

9. Proceedings of the College of Fort William, Home, Miscellaneous. (India Office Library, London)

10. U.G.C. Committee Report, London-1961.

11. Report of the Conference of Directors of Public Instruction, Delhi-1917.
(India Office Library, London)

12. Public Disputation of the students of the college of of Fort William in Bengal, Calcutta-1811
(India Office LIbrary, London)

13. Asiatic Annual Register, London-1805
(India Office Library,.London)

14. Kirpatrick's letter to the court of Directors (Home, Public, Aug.,1785) India Office Library, London.

15. Proceedings, Home, Public, Jan., 1800
(India Office Library, London)

PERIODICALS:

1. The Asiatic Annual Register, London (1801-1807)
(India Office Library, London)

2. The Asiatic Researches, Calcutta (1788-1800)
(India Office Library, London)

3. The Bengal Past and Present
(India Office Library, London)

4. The Calcutta Gazette (India Office Library)

5. Quarterly Review, London-1817
(India Office Library, London)

۱۔ آزاد، محمد حسین۔ آب حیات
رام نرائن بینی مادھو۔ پبلشر و بک سیلر، الٰہ آباد، ۱۹۶۲ء
۲۔ ادیب، مسعود حسن رضوی۔ ہماری شاعری
مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۴۴ء
۳۔ بیمز، جان۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ
(ترجمہ و مقدمہ از پروفیسر احتشام حسین)
دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۷۱ء
۴۔ حسن، محمد۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر
(۱۷۰۷ء سے ۱۸۱۵ء تک) ادارہ تصنیف۔ علیگڑھ، ۱۹۶۴ء
۵۔ حسین، سید عابد۔ قومی تہذیب کا مسئلہ
انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۵ء
۶۔ حسین، آغا افتخار، یورپ میں تحقیقی مقالے
مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء
۷۔ حسین، آغا افتخار۔ یورپ میں اردو
مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء

۸۔ حسینی میر بہادر علی ۔ اردو رسالہ۔ کلکتہ ۱۸۴۰ء
۹۔ صدیقی، محمد عتیق۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد
انجمن ترقی اردو ہند ۔ نئی دہلی۔ ۱۹۷۹ء
۱۰۔ قدوائی، صدیق الرحمٰن ۔ ماسٹر رام چندر
شعبۂ اردو ۔ دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء
۱۱۔ یوسف علی، عبداللہ ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی
تاریخ ـــــ کراچی، ۱۹۶۷ء

हिन्दी:

1- पाण्डेय, मैनेजर, साहित्य और इतिहास दृष्टि पीपुल्स लिटरेसी, दिल्ली, 1981

2- वार्ष्णेय, लक्ष्मी सागर, फोर्ट विलियम कालेज §1800-1854 ई§ हिन्दुस्तानी, एकेडेमी, इलाहाबाद, सं0 2004

3- वार्ष्णेय, लक्ष्मी सागर, §अनुवादक§ गार्सा द तासी की हिन्दुई साहित्य का इतिहास हिन्दुस्तानी एकेडेमी, इलाहाबाद, 1953 ई0

4 शुक्ल, आचार्य राम चंद्र: हिन्दी साहित्य का इतिहास

पत्रिका:

आलोचना, त्रैमासिक, अंक 36, 37,38 §1976 ई0§ सम्पादक: नामवर सिंह राजकमल प्रकाशन प्राइवेट लिमिटेड, दिल्ली।

ضمیمہ

انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ
مستشرقین کی تصنیفات کی فہرست

Writings of the Orientalists Preserved in India-Office Library, London (Hindustani Books)

1. Alexander, C.W.W. and Mukund Lala:
   ZUBDAT AL-HISAB (The Element of Arithmatic),
   Lahore 1868, 1869, 1870-71, 1875, 1877, 1878, and 1879.

2. Anderson, R.P.
   GULI-BAKAWALI (Trans. in English),
   Delhi 1851.

3. Barrow, C.M.
   FOURTH READER (Anglo-Hindustani, 3rd edition),
   Madras 1883

4. Battenburgh, C.A.
   Rifah-i-Khalaiq - A Treatise directed against Prodigality
   in Marriage Expenses and other Social Customs
   Allahabad 1874.

5. Beal, J.B. Or J.W.
   BIJLI KI DAK : THE ELECTRIC TELEGRAPH.
   Agra 1854.

6. Beal, J.W.
   (1) MIFTAH AL ULUM - Lessons in Natural
   Philosophy Translated from the English.
   Sailkot.
   (2) MUFID-AL-ULUM Translated from English.
   Agra 1853.

7. Bensley, Joseph (Fana).
   DIWAN-E-FANA
   Meerut 1876.

8. Capt Thomas Jenkins,

GURU SIMPLE OR SHAIKH CHALLI KA QISSAH-translated by Capt T. Jenkins from Tamil work by C.J. Beschi, Madras 1843.

9. Bocker, L.C.,

INGREZI ILM BAJA KA
Amritsar 1893.

10. Bowley, W., Rev,

(1) ISAI MUSAFIR, Allahabad 1845.
(2) MUSAFIR KA BARHNA, Ludhiana 1840.

11. Bradshaw, J.

FIFTH READER, Madras 1883.

12. Breton, Peter,

HADDIYAON KA BAYAN : OSTEOLOGY,
Agra 1869.

13 Briggs, W., Rev.

(1) AFSARAN-E-PARMAT: THE CUSTOM HOUSE OFFICERS, Ludhiana, 1873.
(2) EK TAMSIL OUR USKI TAWIL, Allahabad, 1872.
(3) NRARAH-I-ILAN, Labore, 1868.
(4) QADR-DANI, Allahabad 1972, Ludhiana 1872-73.
(5) TASWIYAH I ADLO RAHAM, Ludhiana, 1877.

14. Brodhead, A., Rev.

(1) BURJ-I-MUSTAHKAM, Allahabad 1873, Ludhiana, 1875
(2) DINI AUR BUNYAWI TARIKH, Allahabad 1874.

(3) TARIKH-I-KALISIYA, Allahabad 1877.
(4) TUHFATAL ULMA, Amritsar, 1876.

15. Burke, Edmund,
GRAIN AND FODDER CROPS, Lahore, 1892.

16. Burn, R.S.
ILM-I-FALAHAT, Aligarh 1865, Amritsar 1875.

17. Butler, J.H.
AMAL JARRAHI KE, Delhi 1848.

18. Buyers, W., Rev,
YAHUDIYON KA AHWAL (3rd Edn.), Agra 1854.

19. Caleb, J.J. Rev.
(1) INTIKHAB-I-TARIKHI-KALISIYA, Allahabad, 1871.
(2) RASTBAZ AUR SHARIR KA ANJAM,
Allahabad 1872.

20. Carnegi, P.
QAWANIN-I-KALAKTARI, Agra, 1851.

21. Clarke, R., Rev
(1) GIT, Amritsar 1875.
(2) KHAZANAT AL ASRAR, LUDHIANA 1875-76
(3) MIFTAH AL TAURIT, Ludhiana 1876.
(4) RAHI NAJAT, Ludhiana 1875.

22. Collier, W.F.,
WAQA-I-NIGARI INGLISTAN, Lucknow, 1873.

23. Colvin, A,

KARNAMAH-I-KALVIN, Lucknow, 1892.

24. Conard, Rev. Father,

CONFUTATION OF OBJECTIONS, Benaras, 1877.

25. Cooke, C.R.,

Tahrir i Uqlidis, Lahore 1972-73, 1875, 1876, 1877, 1878 and 1879.

26. Corbett, A.F.,

Ilm-i-Falahat, Allahabad, 1869.

27. Corcoran, J.,

Tarikh-i-Mamalik-i-Chin, Vol.1, Calcutta, 1848.

28. Conelius, A.J.,

Khulasai-hidayat i Awadh Polis, Lucknow, 1877.

29. Court, H.M.,

(1) Araish-i-Mahfil, Allahabad, 1871, Calcutta 1882.

(2) Selections literally translated into English, Simla 1872.

(3) Nasre-Benazir, Simla, 1871.

30 Cox. E.T. Capt,

Regimental Moonshi, London 1847.

31. Craven, T.Rev.,

Git ki kitab, Lucknow, 1877.

32. Crooke, W.,

Enthnographical and Folklore Catechism, Mirzapur, 1872.

33. Crossman, H., Rev.
Usul al din al Isawi, Agra, 1873.

34. Currie, F.,
Majmuai imtehani-qawanin, Lucknow 1876.

35. Dacosta, L.,
Lubbal Tawarikh, Calcutta-1829-30.

36 Dallas, A.M.,
Panjab Jail Mannual translated by J. Goldney, Peshawar 1867.

37. Cust, R.N.,
Dastur al amal i patwariyan, Lahore, 1874.

38. Davies, R.H.,
Makhzan al Tijārat, Lucknow, 1871.

39. Davis, B.,
Git, Allahabad 1874.

40. Droese, E., Rev.,
Int aur Rore, Agra 1873.

41. Eastwick, E.B.,
(1) Bagho Bahar, Hertford 1852.
(2) Khirad Afroz, Hertford 1857, Madras 1879.

42. Edmonstone, G.F.,
Majmuat al Jinayat, Agra, 1850.

43. Elgin, Lord,

Tarikh-i-Chin-O-Japan translated by Fredrick Nundy, Lucknow 1867.

44. Elliot, Lieutenant,

Qawaidi Sawaran, Poona, 1877.

45. Erhardt, J., Rev.,

Talim al mubtadi, Agra 1873.

46. Fagan, G.S.,

Procedure of the Civil Court of the East India Company, Calcutta 1852-53.

47. Fallon, F.,

Tarik-i-Shuara i Urdu, Delhi 1948.

48. Fanthome, F.,

Taid-i-Mazhab-i-Roman Katholik, Agra, 1894.

49. Fasken, E.T. Lieut.,

Questions and Answers on Drill, Madras, 1851.

50. Fieldbrave, Isaac, Rev.

(1) Qaid Kusha, Lucknow, 1874.

(2) Yuhanna-i-Faqih Ke Mukashafat, Lucknow 1873. Amritsar 1878.

51. Fink, C.C.,

(1) Ilmi-hikmat, Calcutta 1843.

(2) Talim al nafas, Agra 1853.

52. Fitzpatrick, T.H. Rev,
Tafsil al Kalam (Seripture Text Book)
Lahore 1874.

53. Flavel, J. Rev.,
Chashma-i-Zindagi (The life and teaching of Christ),
Allahabad 1848.

54. Forbes, Duncan,
(1) Bagho Bahar, London 1948.
(2) Tota Kahani, London 1852.

55. Forman, C.W. Rev.
(1) Ajib hikayat, Ludhiana, 1874.
(2) Bayani Fraqlit, Ludhiana 1875.
(3) Iliya Ka Qissah, Ludhiana, 1869-75.
(4) Iltimas, Ludhiana, 1873.
(5) Larkon Ka git mala (Hymns for Children),Luhiana 1875.
Lahore 1872.
(6) Masih Ki paidaish, Ludhiana 1869.
(7) Qissai mar-i-biranji, Ludhiana, 1874.
(8) Qissai Qarzdar, Ludhiana 1869-77.
(9) Qissai Patras, Ludhiana, 1869.
(10) Rahi Salamat, Ludhiana, 1873.
(11) Risalah i tahrif, Ludhiana, 1876.
(12) Sahargah dar Inglistan, Ludhiana, 1868, 1870.
(13) Shukuke-i-Kaffara, Ludhiana 1973
(14) Sual o Jawab, Ludhiana, 1867
(15) Tamsil i Lagar, Ludhiana, 1877.
(16) Tariq-i-Tahqiq, Ludhiana 1877.
(17) Tegho Sipare-i-Iswai, Ludhiana, 1875.

(18) Tuhfata al Muslihin, Ludhiana 1869-75.
(19) Ummed o Jannat, Ludhiana 1868-69.
(20) Wafat-i-Masih, Ludhiana 1867, 1870, 1875.
(21) Zikri Istifan, Ludhiana, 1867, 1870, 1875.

56. Forstyth, Sir, T.D.
(1) Qanun-i-Shahadat, Lahore 1871.
(2) Safar Namah, Lahore 1871.

57. Fox, W.C.E.,
Ilmal Amraz, Rohtak 1878, Lahore 1879.

58. Francis, G.M.,
Pardah Sistam, Jalander, 1895.

59. French T.V., Bishop,
Injil-i-Daud, Ludhiana 1877.

60. Fulford, CJR,
Regula:ions for out post duty, Agra 1872.

61. Gallagher, P.F.
Regulations for Conducting the Musketry Instruction of Army, Bombay, 1869.

62. Garcin de Tassy, J.H
(1) Allegories recits poetiques, II Edn, Paris 1876.
(2) Bagho Bahar (translated into French), Paris 1978.
(3) Gul i Bakawali (translated into French), Paris 1869.
(4) Qissa i Kamrup o Kala, Paris 1835.

68. Gilberne, Charles,

Purane aur Nai Ahad namah ki injil, Ludhiana, 1889.

64. Gilchrist, J.B.

(1) Hindee Manual, Calcutta 1802.

(2) Hindi Story Teller, Calcutta, 1802.

(3) The Oriental Fabulist, Calcutta, 1803.

(4) The Urdu Risalah or Qawaid-i-Zaban-i-Urdu,

Agra 1845,	Calcutta	1820	Madras	1852
		1831		1860
		1846		1873
		1847		
		1875		

65. Gilchrist, R.A.

Cavalry Regulations of Hyderabad Contingent, Madras 1873.

66. Glen, W. Rev.,

Din-i-haqq ki bari baton ka Majmuah, Mirzapur, 1850.

67. Goldney, J. Panjab Jail Manual, Peshawar, 1867.

68. Gowan, B.E.

Capt. Out post Duty, Lahore	1872
	1872
	1872
	1877

69. Graham, G.F., Irving,

Annexation of Panjab, Gazipur, 1865.

70. Griflin, G.

Catechectical Explanation of Field Excercises, Calcutta 1847

71. Haim, David,

Shahjan Shahpari aur Roshan-Jahl, Bombay 1876.

72. Halket, W.G.C., Capt.

Musketry Regulations, Lahore 1877.

73. Hari, John,

(1) Masahi Musafir Ka ahwal, Ludhiana 1869, Lahore 1870.

(2) Sair i talib-al-najat, Allahabad, 1847-50.

74. Hartman, Anastasius,

Naya Ahadnamah, Sarrdhana 1879.

75. Hewlett, John, Rev.

Agustinas Ke iqrarat, Mirzapur, 1876.

76. Hoernle, T. Rev.

Maqaddas Kitab Ka ahwal, Agra 1847 Ludhiana 1869, 1873, 1873, 1877

77. Hogg, R.W.

Field Exercises, Calcutta 1837.

78. Hoggon, Major,

Musketry Instruction, Ludhiana, 1873.

79. Holroyd, W.R.M.

(1) How to Speak and Write English (Eng-Urdu Edn), Lahore 1875.

(2) Jugraphiah-i-Panjab, Lahore 1870.

(3) Scheme for Translitrating Urdu in Roman Characters, Amritsar 1878.

(4) Tashil-al-Kalam (Hindustani-English Dialogues), Delhi 1867, Lahore 1876.

80. Hooper, W, Rev.

(1) Asha-i-Rabbani, Lahore 1878.

(2) Begunahi-i-Masih, Amritsar, 1878.

(3) Haqiquat-i-Gunah, Amritsar 1878.

(4) Jahan Ka nur, Ludhiana, 1876.

(5) Masih Ki Badshahat, Ludhiana 1875.

(6) Namaz ki tartib, Ludhiana 1875.

81 Hoskins, R. Rev.

(1) Khalid-al-kitab, Allahabad 1878.

(2) Yuhanna ki Injil ki Tafsir, Lucknow 1876, Ludhiana 1876.

82. How, W.W. Rev.

Nasahat al Asha, Agra 1872.

83. Humphrey, E.J. Rev.

Akhlaqi Kahanian, Lucknow 1875.

84. Humphrey, Mrs.

(1) Do Julahon ki guftugu, Allahabad, 1871.

(2) Salib Bardar, Lucknow 1874.

85. Irving, Mrs.

Ghar Ka Rasta, Allahabad, 1874.

86. Jacob, Joseph, Rev.

(1) Jughraphia i pak Kitab, Agra 1867.

(2) Khilwati Duaon Ki kitab, Agra 1875.

87. Jenkins, Thomas.

(1) Articles of War (Qawaid Lashkari), Madras 1843.

(2) Shaikh Challi ka Qissah (translated from Tamil work by C.J. Beschi), Madras, 1843.

88. Jeremy, E.L.

(1) Git Ka dilchasp Bayan, Agra 1874.

89. Johns, S.P.

(1) Nadim al tulba, Agra 1870-75.

(2) Tashrih al izam, Agra 1869.

90. Johnson, T.S. Rev.

(1) Injil ke Khidmatguzar, Lucknow, 1877.

(2) Tamsili nasihaten, Ludhiana, 1876.

(3) Wadi-al-tubah, Lucknow 1875.

(4) Zamindar ki Tamsil, Ludhiana, 1877.

91. Johnson, W.F. Rev.

Mukhzan-i-Masihi, Allahabad, 1869-78.

92. Johnston, J.W.,

Ilaj al amraz, Ludhiana 1868.

93. Kempson, M.,

Taubat-al-Nasuh, London 1886, Delhi 1889.

94. King, J.S. Leiut.

Position Drill, Bombay, 1877.

95. Knowles, S. Rev.

Risala-i-miraj, Amritsar 1878.

96. Kristnia, Jamadar,

Catechism on the New System of Drill for Attack Formations for the Native Army, Bombay 1876.

97. Lawrence, Lord,

Life of Lord Lawrence by R. Bosworth Smith, Lucknow, 1886.

98. Lazarus, E.J.

Waquiat-i-Rabinsan Kruso, Benaras 1877.

99. Ledlie, J.P.,

(1) Daroghah ka Dastur al amal, Agra, 1851.

(2) Dastur al ma'ash, Allahabad 1873.

100. Lees, W. Nassau,

Ghuncha-i-Sidq, Calcutta 1854.

101. Leitner, G.W.,

Sinin-i-Islam, Lahore, 1871-76.

102. Leslie, Miss.

Matla-i-nur, Ludhiana 1875.

103. Leupolt, C.B. Rev.,

Din-i-haqq ki tahqiq, Allahabad 1846.

104. Loyal, C.J.,

Bol Chal, Lahore 1897.

105. Lucas, J.J. Rev.

(1) Alqab-i-Masihi, Allahabad 1876.

(2) Daktar Judson Sahib, Ludhiana 1877.

(3) Qissah-i-Thuma (The story of Thomas), Mirzapur 1877.

106. Macleane, W.C.

Treatise on Small Pox, Madras 1857.

107. Mansel, H. Rev.

Radd-i-ra'e i islam, Lucknow, 1877.

108. Manuel, G.S.,

Rahnuma-i-Dihli, Delhi-1874.

109. Manuel, Joseph,

Diwan-i-Joseph or Guncha i Khatir, Patna, 1868.

110. Manuel, T.,

Ikhwan al Safa, Calcutta 1860.

111. Marden, T.

Third Reader (Anglo Hindustrani), Madras 1886.

112. Marshall, H.S.

Attack Formation, Moradabad 1877.

113. Martin, G. Rev,

Khulasa-i-talim-i-din, Benaras, 1868.

114. Mertyn, H., Rev/

New Testament, Serampur, 1814, London, 1819.

115. Mather, Mrs.

Lughat-i-Kitab-i-Miqaddas, Mirzapur, 1875.

116. Mather, R.C.

Din-i-haqq, Mirzapur, 1850.

117. Maxwell, H.H.

Miftah al Zafar, Benaras 1852.

118. Mc Master, G., Rev.

Mumanat-i-qasam-i-laghw, Ludhiana 1874.

119. Meacham, W.M. Capt.

Standing Orders for Bengal Infantry, Benaras 1875, 1878.

120. Medley, J.G.

Bayan Pulon Ka, Rurki 1865.

121. Menzies, O.

Dril Manual, Lahore, 1877.

122. Michael, J.

Ikhwan al Safa, London, 1829, Madras, 1840, Bombay, 1844.

123. Miles, F.A.

Pinnock's Catechism of Astronomy, Lucknow 1832.

124. Mohan, David, Rev.

Shuja al Din, Allahabad 1876.

125. Monier-Williams, Sir, M.

Bagh o Bhar (In Roman Characters)

Bangalore 1872, Benaras 1870, Bombay 1874, 1877. Cawanpore 1867, 1869, 1875, 1876. Delhi 1868, 1869, 1871, 1874, 1875, 1876. Lucknow 1873, 1876. London 1859 Madras 1876.

126. Moore, J.J.

(1) Acts and Orders for N.W. Provinces 1840-43, Agra 1847

(2) Majma al Qawanin, Agra 1845-46.

127. Moore, W.J.

(1) Mata ka tika, Beawar 1867.

(2) Mukhtsar yad-dasht-i-haizah, Beawr 1867.

128. Morris, J,

English Proverbs with Hindustani, Cawnpore 1893 Lahore 1896.

129. Morrison, Miss.

Safinat al najat, Ludhiana, 1870, 73, 74.

130. Muir, D.

Hidayatnamah i Malguzari, Agra 1848-49, Lahore 1869

131. Mungo, Park.

Safarnamah-i-Mungo Park, Agra 1842.

132. Myers, J.H. Rev.

(1) Gumgashtah Farzand, Ludhiana 1876.
(2) Ziyafat-i-Shadi, Ludhiana 1869.

133. Newton, J. Rev.

(1) Ishtihar, Ludhiana 1874.
(2) Jaisi Karni waisi Bharni, Ludhiana 1874.
(3) Khuda ke aqwal, Ludhiana 1875.
(4) Khulasat al waz, Ludhiana 1875.
(5) Mubarak Kaun hai, Ludhiana 1875.
(6) Rel Ka tikat, Ludhiana 1875.
(7) Sharo fazl, Ludhiana 1875.
(8) Tahqiq al Waqiat al Injil, Ludhiana 1875.
(9) Taubah ki zarurat, Ludhiana 1874.

134. Norman, C.B.

(1) Chandmari Sikhane ke qanun, Lahore 1874.
(2) Suider Rifle Exercise, Lahore 1875.

135. Owen, J. Rev.

Tarjumah-i-Mazamir, Allahabad. 1868.

136. Parker, E.W. Rev,

Muntakhabat-i-git, Moradabad 1872.

137. Parsons,J.

Svara-Sangraha (Romal Characters), Benaras 1875.

138. Pavie, Theodore

Tarikh i Asham, Paris 1845.

139. Perkins, Rev.

Bahr-i-Hikmat, Lucknow 1847.

140. Perkins, H.E., Rev.

(1) Burhe Ka Ghar, Ludhiana 1874.

(2) Isa ki Sirat, Ludhiana 1876.

(3) Jesika ki Pahli Dua, Lahore 1874.

(4) Khanagi dua'en, Ludhiana 1870.

141. Perkins, P.H.

Muntakhabat-i-Urdu, Lahore 1868.

142. Pesch, J. (Shor),

Diwani Shor, Meerut 1872-78.

143. Pezzoni, A., Rev.

Hindustani Talim, Calcutta 1873.

144. Pfander, C.G., Dr.

(1) Hall al ishkal, Lucknow, 1874.

(2) Tarikh al hayat, Ludhiana - 1875.

145. Pincott, Frederic A

Alaf Lailah, London 1882, Cawanpore 1884.

Delhi 1890.

146. Platts, J.T.

Ikhwan al Safa, Calcutta 1860, London 1869.

147. Reid, H.S.
Tarikh-i-alam, Allahabad 1855, Lahore 1868.

148. Rose, H.A.
Rules for the Guidance of Panchayats, Ludhiana 1895.

149. Rosen, Friedrich,
Indrasabha des Amanat, Leipzig 1982.

150. Rudolph, A. Reh.
(1) Baiza farosh ka ahwal, Ludhiana, 1867, 69, 73, 77.
(2) Girdab, Ludhiana, 1868, 1873.
(3) Madd o jazr, Ludhiana 1868, 69, 73.
(4) Numan-i-mabrus, Ludhiana 1868, 69, 77.
(5) Qissah i-Habshi ghulam, Ludhiana, 1868-77.
(6) Qurbani-i-Ishaq, Ludhiana 1869.
(7) Rahbar-i-haqiqi, Ludhiana, 1873.
(8) Taswir-i-haqiqi, Ludhiana 1869.

151. Sabunjie, J.L. Rev.
An-Nahlah or "The Bee" - An illustrated Eastern and Western fortnightly (English and Hindustani), London 1877.

152. Sandeman, H.
Haize Ka Ilaj, Allahabad 1853.

153. Sandesman, H.D.,
Taiyari-i-Sarak, Allahabad, 1854.

154. Saunders, R.F.,

Mazhar al Ulum (Discoveries of Science) (a monthly magazine), Ghazipur, 1875-78.

155. Scott, J.M.

Risaiah i Surveying (Gaometrical Surveying), Cawanpore 1874.

156. Scott, P.G. Colonel,

Standing Orders, Benaras 1877.

157. Scott, T.J. Rev.

(1) The Gospels of Matthew and Mark with Commentaries (Tafsir Mati aur Marqus ki Injil ki) Roman Character, Lucknow 1875.

(2) The Gospel of Luke and John with Commentaries (Roman Characters), Allahabad 1871.

(3) Ilm-i-Ilahi-i-aqli (Natural Theology), Lucknow 1877.

(4) Ilmi Mantiq (The Science of logic) (English and Urdu) Lucknow 1873, Amritsar 1875.

(5) Taqdis al Lughat (A Dictionary of Bible Names), (Roman Character), Lucknow 1873.

(6) Taqdis al kitab, Lucknow 1874.

158. Sell, E., Rev.

(1) Chamanistan-i-agib, Madras 1873, 74, 76, 78.

(2) Haqaiq al maujudat (Natural Philosophy), Madras 1873, Bangalore 1874

1875

1877

(3) Jamil al Qawanin, Madras 1877-87.

(4) Jugharafiah, Madras 1875-77.

(5) Khulasat al Qawanin (An Elementary Grammer), Madras 1874, 78, 79.

(6) Kitab i Salis (Ancedotes for Children), Madras 1874, 76, 77.

(7) Muntakhabat-i-Urdu, pts.i, II and VI, Madras 1870-71.

(8) Talim al atfal, Madras 1890.

159. Shakespear, John.

Muntakhabat-i-Hindi(with a verbal translation and grammatical analysis of some part), Vol. 2, London 1817-18 and 1824-25.

160. Sherring, M.A. Rev.

(1) Al kitab ke maqamat at maruf, Hizapur 1860.

(2) Imarat al maruf II ed. Mirzapur 1860.

(3) Lughat-i-kitabi-muqaddas, Mirzapur 1875.

(4) Mirat al herkat Mirzapur 1861.

(5) Mufarrih al qulub, Mirzapur 1866.

(6) Muntakhab al ilm, Mirzapur 1860.

(7) Shuhrat al Mazab al Masih, Mirzapur 1862.

(8) Tazkirat al aqilin (II ed.), Mirzapur 1861.

161. Shurman, J.A.

Tarikh Mutaqaddimin o Muta a' khkhi, Calcutta 1852 Allahabad 1851

162. Sibthorpe, L.H.

(1) Catechism on attack formation, Bombay 1876.

(2) Catechism on Misketry Instruction, Bombay 1875-79

163. Small, George,

Tota Kahani, London 1875.

164. Smith, L.F.

Bagh o Bahar (Translation with notes), Calcutta 1813-42
Lucknow 1870 and
Allahabad 1896.

165. Smith, R.H.

Decisions of the Suddar Dewani, N.W. Provinces for
1860-1851, Agrn 1852.

166. Smith, W. Rev.

(1) Dini haqq ki tahqiq, Allahabad 1846, Ludhiana 1891.
(2) Tariq al hidayat, Mirzapur 1850.

167. Smyth, W.C.,

Lata' if i Hindi (with the Shula i Ishq of Mir Mohammad
Taqi) London 1840.

168. Solomon, Edwin,

Haqiqat al Susan Amritsar 1876.

169. Spilsbury, G.G.

London Pharmacopocia. Calcutta 1843-45.

170. Steel, Mrs.

Urdu ki Tisri Kitab, Lahore 1879-80

171. Stern, Rev.

(1) Chand Mufid hikayaten, Mirzapur 1872.

(2) Sual o jawab, Benaras 1863.

(3) Kaifiyat namah i bani Israil Allahabad 1867.

172. Stewart, Rev.

Masihi Kalisiya ki Tawarikh, Sailkot 1892.

173. Stillwell, Capt.

Rifle Exercise, Calcutta 1876-77, Lahore 1877.

174. Stockman, A., Rev.

Catechism of Christian Religion Calcutta 1873.

175. Sutherland, Major,

Tarikh i Badshahan i Inglistan, Agra 1855.

176. Thide, Miss.

Bhajan aur git, (without title page) Ludhiana 1875-76

177. Thomas, D.W. Rev.

Tafsir i kitab i Paidaish, Lucknow 1877, Delhi 1888.

178. Thomas, J., Rev.

(1) Dabistan i marifat, Lucknow 1877.

(2) Guldastah i akhlaq, Lucknow 1875.

(3) Misbahah al Balaghat, Lucknow 1875.

179. Trant, W.H.

Khulasha i Fihristnuma, Calcutta 1820.

180. Tucker, C., Miss,

(1) Amanat i besh qimat, Ludhiana 1877.

(2) Bachchon ki Shadi, Ludhiana, 1878.
(3) Banaras ke do Jatri, Ludhiana 1878.
(4) Buti ki Kahani, Ludhiana 1877, Amritsar 1878.
(5) Chamakdar Roshni, Amritsar 1878-79, Ludhiana 1877.
(6) Chamakne Wali Poshak, Ludhiana 1877.
(7) Das ahkam ki Tamsili hikayaten, Ludhiana, 1877.
(8) Dili Sakhawat, Ludhiana 1877, Amritsar 1879.
(9) Ed Tamsil Ludhiana 1877.
(10) Ghuncha-i-Tamsil, Ludhiana, 1878.
(11) Husul i Jawahir, Ludhiana 1878.
(12) Ifshai raz, Ludhiana 1877.
(13) Khun se Kharida hua, Allahabad 1875.
(14) Mard i nauzad, Ludhiana 1877.
(15) Qissa i Jai Singh (a Christian convert), Ludhiana,1878.
(16) Raja aur Naucar ki tamsil, Ludhiana 1877.
(17) Rastbaz hakim, Ludhiana 1877, Amritsar 1877-78.
(18) Suraj ki roshni bhitar ane do, Amritsar 1879.
(19) Tiladar Pagri, Ludhiana, 1877.
(20) Tin Jawahir ki Tamsil, Ludhiana, 1877, Amritsar 1978.
(21) Tuti tatti ki tamsil, Amritsar 1878.
(22) Wilayat Ali Shahid ka bayan, Amritsar 1877-78.

181. Tucker, Henry Carre,

Yasu masih ka ahwal, Ludhiana, 1877.

182. Ullmann, J.F. Rev.

(1) Gitmala, Ludhiana 1871.
(2) Gitawali, Allahabad 1876, Ludhiana 1877.
(3) Mizan al Din, Ludhiana 1870, 1874.
(4) Su'al ojawab aur git, Ludhiana 1868-75.
(5) Wuh abadi ahd, Allahabad 1874.

(6) Wuh umda qadim naql, Allahabad 1871, Ludhiana 1871, 73, 75.

183. Velentine, C.S. Dr.

(1) Dua aur qual ka Khazanah, Agra 1868.

(2) Hawa ki Paidaish (Pneumatics and Chemistry), Agra 1867.

184. Walker, Dr.

Gothan Sitala ka tika (Vaccination), Agra 1853.

185. Walker, J.P., Dr.

Mubtadi ki Pahli Kitab, Agra 1854.

186. Wall, Joseph,

Ikhwan al Safa, Lucknow 1874-89.

187. Walsh J.J. Mrs.

Guldasta i Tiflan (II ed.) Allahabad 1867-71.

188. Wrren, J. Rev.

(1) Dua tilim aur ayaten, Allahabad 1848.

(2) Rahi I Zindagi, Allahabad 1850-76.

(3) Sachchi danish, Allahabad 1848.

(4) Taswir i Zillat i gunah, Allahabad 1878.

189. Wheeler, J.T.

Tarikh i jalsah i qaisari, Lahore 1883.

190. Wherry, E.M. Rev.

(1) Aqa aur naukar, Ludhiana 1872.

(2) Bigre hue larke ki hikayat, Ludhiana 1875.
(3) Do ghar ki Tamsil, Ludhiana 1872-73 and 1877.
(4) Ghunghion ki Hikayat, Ludhiana 1876.
(5) Janam Kundli, Ludhiana 1876.
(6) Khat banam Jawanan i Hind, Ludhiana 1870-72.
(7) Malikah ki hikayat, Ludhiana 1875.
(8) Masih ibn Allah, Ludhiana 1875.
(9) Murghi ki hikayat, Ludhiana 1875.
(10) Paigham i Allah, Ludhiana 1875.
(11) Phulon ka har (Christian Doctrine), Ludhiana, 1876.
(12) Rassi ki Tamsil, Ludhiana 1872-73 and 1877.
(13) Shahzadah ki hikayat, Ludhiana 1876.
(14) Silk ki gauhar, Ludhiana 1876.
(15) Taj Ki tamsil, Ludhiana 1871-73, 75, 77.
(16) Tazkira i aurat, Ludhiana 1876.

191. Wilkinson, W. Rev.
Ilm i Jughrafia, Aligarh 1869-71.

192. Williams, H.R.
Fitrat i insani, Allahabad 1893.

Tahqiq al din al quam, Allahabad 1892.
(Revised ed. of the book mentioned below)
Tahiq al jaza al ukhrawi, Agra 1873-74.

193. Williams, T. Rev.
Muhammad ;ki tawarikh ka ijmal, Ludhiana 1891
(comparison of the life of Mohd with Christ.)

194. Wilson John Rev.

(1) Guftugu fidin al islam, 3rd ed. Madras 1843

(2) Musalmani din ka raddiya, Bombay 1834

195. Wilson, P.T. Rev.

Nur i hidyat II ed., Lucknow 1873.

196. Wood Henry,

(1) Hall i Suat i hisab, Lahore 1874.

(2) Kitab i hisab ka hall, Lahore 1877.

197. Wynyard, W.

(1) Dastur al amal aminan, Lahore 1850.

(2) Directions to settlement offices, Lahore 1850.

(3) Hidayatanamah i Peshkaran i Partal, Lahore 1850.

(4) Hidyatnamah i tahsildar, Lahore 1850.

(5) Namunah i Kaifiat i Haisiyat i dehi, Lahore 1850.

(6) Rules for the preparation of Survey Maps, Lahore 1850

گزشتہ کئی برسوں سے یہ عام شکایت ہے کہ یونیورسٹی سطح پر اردو میں تحقیق کے نام پر جو کام ہو رہا ہے بہ اعتبار معیار، کم عیار و بے خراد ہے۔ مقالات میں بیشتر وہ ہیں جن میں بجائے تحقیق کے صرف اور صرف تنقید پر بنائے کار رکھی گئی ہے۔ تنقید کی اہمیت و افادیت مسلّم مگر تنقید کی آزادیوں کو بروئے کار لاکر ہفت خواں طے کرنا ایک بات ہے اور تحقیق کے صبر آزما میدان سے استقامت کے ساتھ گزر جانا دوسری بات۔

ڈاکٹر علی جاوید کا یہ مقالہ تحقیق و تنقید کا بہترین امتزاج ہے۔ انھوں نے بنائے کار تو تحقیق پر رکھی ہے مگر استنباطِ نتائج کے ضمن میں تنقیدی تجزیاتی طریقِ کار کو آزمایا ہے۔ ان کا موضوع برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے روایتی و متداول تحقیقی موضوعات سے مختلف اور قدرے محنت طلب ہے۔ علی جاوید کو اس مقالے پر جواہر لعل یونیورسٹی نے ۱۹۸۳ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔

علی جاوید نے درونِ ملک میں موجود متعلق ذخائر ہی کو نہیں کھنگالا، برونِ ملک ان ذخائر کا بھی پتہ لگانے کی سعی کی ہے جن سے استفادہ کیے بغیر بھی یہ منزل سر کی جا سکتی تھی۔ مگر ظاہر ہے اپنے معیار میں اس کی سطح مختلف ہوتی۔ علی جاوید نے جس محنت، جانفشانی اور یکسوئی کے ساتھ یہ کام مکمل کیا ہے اس کے لیے وہ یقیناً تحسین کے مستحق ہیں۔ میں اس مقالے کو ان قلیل ترین کارناموں میں شمار کرتا ہوں جو آئندہ برطانوی مستشرقین کے سلسلے میں کام کرنے والوں کے لیے معاون دحوالے کا حکم رکھتا ہے۔

عتیق اللہ
شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی

BRITISH ORIENTALISTS AND THE HISTORY OF URDU LITERATURE

(BARTANVI MUSTASHRIQUEEN AUR TAREEKH-E-ADAB-E-URDU)

by

Dr. Ali Javed

Rs 200/-

Sterling Pound 8/-
US Doller 10/-